خود آگہی

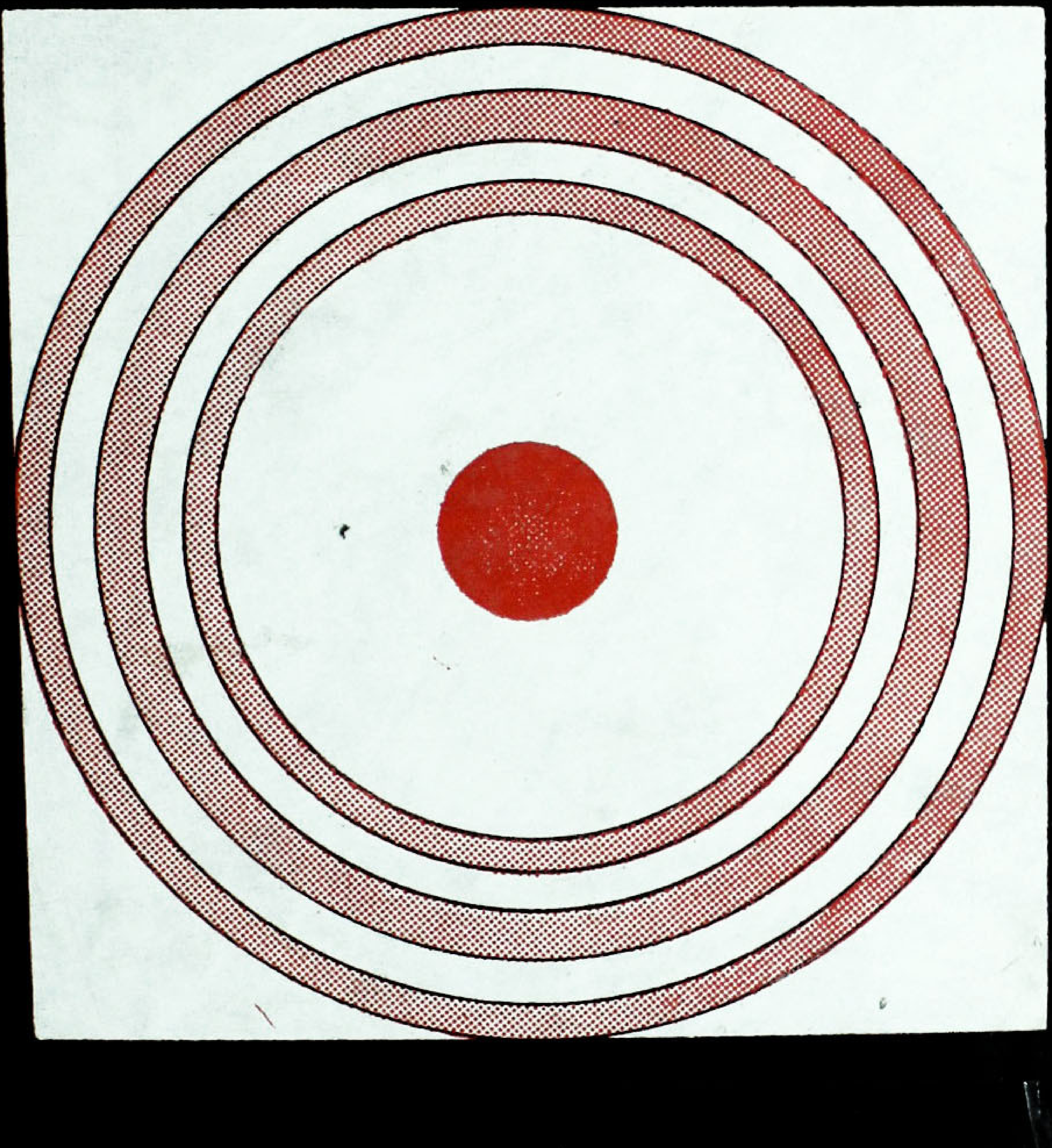

297.
خ 3
770

وہاج الدین علوی

Marfat.com

خود آگہی

وہاج الدین علوی

Marfat.com

© وہاج الدین علوی

KHUD AAGAHI
DR. WAHAJUDDIN ALVI
Rs. 75/=

۳۹۲۰۱۹۴
خ 32
۲۲۰۱۴۶

نام کتاب : خود آگہی
نام مصنف : وہاج الدین علوی
شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 25
نام پبلیشر : وہاج الدین علوی
مطبع : لبرٹی آرٹ پریس، پٹودی ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی
قیمت : =/75روپے
پہلی بار : دسمبر ۱۹۹۹ء
تقسیم کار :

صدر دفتر :
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی

شاخیں :
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ اردو بازار۔ دہلی110006
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ پرنس بلڈنگ ممبئی400003
مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ۔ یونیورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202002

Marfat.com

دیباچۂ کتابِ ولایت
کے نام

Marfat.com

Marfat.com

ع دیباچۂ کتابِ ولایت ہیں مرتضیٰ

بیدم شاہ وارثی

Marfat.com

Marfat.com

ترتیب

تصوف کی باتیں — مصنف — ۹

تذکرۂ غوثیہ
(حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ) — ۲۱

آپ بیتی
(حضرت خواجہ حسن نظامیؒ) — ۳۳

نقشِ حیات
(مولانا حسین احمد مدنیؒ) — ۴۹

آپ بیتی
(شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ) — ۶۴

Marfat.com

Marfat.com

تصوف کی باتیں

زیرِ نظر کتاب میں چار خود نوشت سوانح عمریوں کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے ان کے مصنفین مذہبی اشخاص تھے۔ اسی لیے ان خود نوشتوں کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کو مذہبی افکار و نظریات اور تصوّف کی اصطلاحات سے قدم قدم پر سابقہ پڑتا ہے۔ ان چاروں خود نوشتوں میں مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کی روح جاری و ساری ہے۔ لیکن عرفانِ نفس کا دروازہ کھٹکھٹانے کا یہ عمل بہت ہی کٹھن اور حوصلہ شکن ہوتا ہے۔ اس راہ میں انا کی ہزارہا بستیوں اور خود فریبی کے لہلہاتے ہوئے مرغزاروں کو روندتے ہوئے گزرنا پڑتا ہے۔ جس کی توقع کسی دنیادار سے کرنا عبث ہے۔ یہی سبب ہے کہ دنیا کی بہترین خود نوشتوں پر بھی حقائق کو توڑ مروڑ کے پیش کرنے کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ ہاں CONFESSIONS (اعتراف) پر کسی نے FABRICATION کا الزام عائد نہیں کیا۔ میرا خیال ہے کہ اچھی خود نوشت سوانح عمریوں پر FABRICATION کا الزام عائد کرنا خود نوشت نگار کے ساتھ زیادتی ہے۔ حقائق کو تخلیقی زبان میں پیش کرتے ہوئے علائم اور استعارات سے گریز کرنا ممکن نہیں ہے اور بعض مضامین تو استعارات اور علامات ہی کے پردے میں بیان ہو سکتے ہیں۔ بالخصوص حسن و عشق کے معاملات یا آدم زاد کی جبلی ضرورتوں کا اظہار اگر براہِ راست کیا جائے تو پھر وہ ادب پارہ نہیں ٹیلی ویژن

Marfat.com

کا اشتہار ہو جائے گا۔

ہمارے ادب میں از قسمِ اعترافات کوئی صنف نہیں ہے، وجہ بالکل واضح ہے۔ اسلام اور ہندو دھرم دونوں کے عقائد میں گناہ معاف کرنے کی طاقت کسی بشر کو حاصل نہیں اور نہ ہی کلیسا جیسا کوئی نظام ہے لیکن CONFESSIONS کا محرّک جو جذبہ ہے وہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہماری مذہبی خود نوشتوں میں نظر آتا ہے۔ امام غزالی کی خود نوشت المنقذ من الضلال سے لے کر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی آپ بیتی تک معرفت کا سلسلہ جاری ہے۔ تحدیثِ نعمت تزکیۂ نفس اور صفائے باطن پر اصرار کرتے ہوئے خود نوشت نگار دراصل حقیقتِ اولیٰ کی تلاش میں منہمک ہوتا ہے۔ تلاشِ حق میں جو مشکلات اور جن تجربات سے وہ گزرتا ہے اُن کا بیان دراصل اُس کا مطمحِ نظر ہوتا ہے۔ آج جب کہ مادیّت اور خود پرستی کے سیلاب میں انسان اور اعلیٰ انسانی اقدار تقویم پارینہ ہونے کو ہیں ایسے لٹریچر کی شدید ضرورت ہے جو دلوں میں محبّت، مروّت، اخوّت، صلہ رحمی کی بجھتی ہوئی چنگاریوں کو روشن کر دے۔ ابھی ہمارے معاشرے میں دل کی پکار اور روح کی پیاس موجود ہے۔ مادّی تہذیب کے بحران نے ہی مادیت سے بیزاری اور روحانیت کی پناہیں تلاش کرنے پر بھی مجبور کر دیا ہے۔ بقول ابوالحسن علی میاں ندوی:

"تقسیم کے انسانیت سوز ہنگامے نے جب دلوں کو زخمی کیا، اور لاکھوں انسانوں نے اس دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی بے وفائی کا منظر دیکھ لیا تو ان کو بھی زخمِ دل کے لیے مرہم کی ضرورت ہوئی آج دونوں طرف بے خانماں اور شکستہ دل انسانوں کو اہلِ درد و محبّت کے حالات اور تذکروں کی سب سے زیادہ تلاش ہے"[1]

ان چاروں مذہبی خود نوشتوں کا تعارف اور تجزیہ پیش کرتے ہوئے میرے مدِ نظر بھی یہی جذبہ ہے۔ دلوں میں آگ ہے لیکن اسے روشن کرنے کے لیے

---

[1] فضل رحمٰن۔ ص ۱۱۔ ابوالحسن علی ندوی بار چہارم اسکائی لائن پرنٹرس۔ لکھنؤ۔

Marfat.com

اہلِ درد و محبت کی داستانِ حیات کی بازخوانی ضروری ہے۔

افسردگیٔ سوختہ جاناں ہے قہر میرؔ
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

بادی النظر میں یہ خود نوشتیں چار اصحاب کی زندگی کے واقعات ہیں لیکن ان واقعات میں پاسِ شریعت، حُبِّ رسول، جذب و شوق، جود و سخا، بذل و عطا، احترامِ آدمیت، دکھے دلوں کی راحت رسانی، امر بالمعروف نہی عن المنکر۔ ادب و شاعری غرض کہ من لگن کی ایک دنیا آباد ہے۔ ان محبوب خصلتوں کے لیے طریقِ تصوف کی اصطلاح ہمارے اجتماعی لاشعور کا حصّہ بن چکی ہے لہٰذا تصوف اور طریقِ تصوف پر کچھ باتیں بے محل نہ قرار پائیں گی۔

صوفی کی اصطلاح اور اس کے اشتقاق پر بہت سی بحثیں کی گئی ہیں۔ مثلاً صوفی کی نسبت اصحابِ صُفّہ کی طرف ہے یا یہ کہ صوفی صف سے مشتق ہے۔ اور کچھ اصحاب کا خیال ہے کہ صوفی لفظِ صُوف (اون) سے مشتق ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ صوفی صفا سے مشتق ہے یعنی جن اصحاب کے قلوب کو اللہ نے صفائی باطن عطا فرمائی ہے وہ صوفی ہیں۔

لیکن امام قشیری کی تحقیق کی روشنی میں رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابۂ کرام کے لیے صحابیت سے بڑھ کر کوئی فضیلت نہ تھی دوسرے لقب کی انھیں حاجت نہیں تھی۔ جن بزرگوں نے صحابہ کی صحبت اختیار کی وہ تابعین کہلائے اور تابعین کے فیض یافتہ اتباع تابعین کے لقب سے یاد کیے گئے لیکن دوسری صدی کے آتے آتے ملوکیت نے خلافت کی جگہ لے لی تھی۔ اور ملوکیت کے ساتھ ساتھ اُس کی رحمتیں اور لعنتیں بھی عام ہو رہی تھیں۔ چنانچہ زہّاد اور عبّاد کا دور دورہ ہوا۔ ان لوگوں میں بعض ریاکار اور زمانہ ساز اشخاص سے ان کی وضع اختیار کی اور بدعات کا ظہور ہوا اور ہر فریق نے اپنے زہد کا دعویٰ پیش کیا۔ زمانہ کا یہ رنگ دیکھ کر خواص اہلِ سنّت نے جن کے قلوب حق تعالیٰ کے ذکر سے غافل نہیں تھے جن میں

Marfat.com

عشقِ الٰہی اور خشیتِ الٰہی کا جذبہ کارفرما تھا۔ زمانہ سے علاحدگی اختیار کی اور
ہیچ آفت نہ رسد گوشۂ تنہائی را۔ پر عمل پیرا ہو کر یادِ الٰہی میں مشغول ہو گئے۔ اس
طرح انھوں نے تزکیۂ نفس اور تعمیرِ باطن کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ چونکہ
یہ طریق کوئی الگ سے علم یا فن نہیں تھا بلکہ قرآن اور احادیث کے احکام کا
عملی پہلو تھا اس لیے اس کی کوئی تعریف اور توضیح کی ضرورت بھی نہ تھی
لیکن تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں اہلِ دنیا نے حرص و ہوس اور جاہ پرستی
کے سبب طرح طرح کے فلسفے گڑھنے شروع کر دیے اور طریقِ تصوّف کو بھی
اپنی مطلب براری کے لیے بدنام کرنے لگے۔ لہٰذا اس عہد کے اجل
صوفیا نے تصوّف کی روح اور اس کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کے لیے اس
کی توضیح اور تشریح فرمائی۔ چند اکابر اولیاء اللہ کے قول نقل کیے جاتے ہیں
تاکہ واضح ہو سکے کہ اصل تصوّف کیا ہے۔ ابراہیم ادہمؒ کے نزدیک تصوّف کی حقیقت تکریم
(یعنی تمام مخلوق کو اپنے سے بزرگ سمجھنا[۲]) اور اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دینا اور
لوگوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا ہے۔ اسی طرح سید الطائفہ حضرت جنید
بغدادیؒ نے فرمایا صوفی کو ان آٹھ خصوصیات کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے جن سے
آٹھ پیغمبروں کی پیروی ہوتی ہے۔ سخاوت حضرت ابراہیمؑ کی سی ہو، رضا حضرت
اسماعیلؑ کی سی، صبر حضرت ایوبؑ کا ہو، اشارات حضرت زکریاؑ سے ہوں۔ غربت
حضرت یحییٰؑ کی سی ہو، سیاحت حضرت عیسیٰؑ۔ لباس حضرت موسیٰؑ کا ہو اور
فقر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو[۳] یعنی صوفی اپنے اعمال اور افکار میں
پیغمبرانِ اولوالعزم کا متبع ہو۔ آیئے قرآن و حدیث کی روشنی میں اسی طریق کا تجزیہ
کیا جائے۔ قرآن نے اس طریق کو تزکیہ اور احسان کے ماثورہ نام سے یاد کیا۔[۴]

۲۔ رسالہ قشیریہ ص ۱۲۷ قرآن اور تصوّف۔ ڈاکٹر میر ولی الدین ص ۱۳ ندوۃ المصنفین جامع مسجد
دہلی سنہ ۱۹۶۸ء۔ طبع چہارم

۳۔ بزمِ صوفیہ۔ صباح الدین عبد الرحمٰن ص ۱۹ دار المصنفین اعظم گڑھ، جون ۱۹۷۹ء

۴۔ تزکیہ اور احسان، مولانا ابوالحسن علی ندوی۔

Marfat.com

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی دیگر صفات کے علاوہ یہ بھی بیان فرمایا کہ ان میں انھیں میں سے ایک رسول بھیجا جو آیتیں پڑھتا اور انھیں پاک کرتا ہے اور کتاب حکمت کی باتیں سکھاتا ہے[۵] کیا ایمان والوں کو ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل جھک جائیں اللہ کی یاد میں[۶] اور ایسے ہی اصحاب کو قرآن کریم نے ولی اللہ کے نام سے پکارا ہے۔ فرماتا ہے اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (یونس ۶۲) سن رکھو وہ اللہ کے دوست ہیں ان کو نہ کچھ خوف ہوگا نہ وہ غمناک ہوں گے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب نے فرمایا "یہ آیت کریمہ اور اس کا مضمون بالکل درست ہے لیکن اولیار کی عبادت نہیں ہونی چاہیے ہاں آپ پر لازم ہے کہ ان سے محبت رکھو ان کی پیروی کرو۔ ان کی کرامات کا اقرار کرو۔ یہ بھی یاد رکھیئے کہ اولیار کی کرامات کے منکر صرف بدعتی اور گمراہ لوگ ہی ہیں"[۶]

قرآن نے اولیار اللہ اور اولیار الشیطان، دو گروہ بتلائے ہیں۔ اولیار اللہ کی شان کے سلسلے میں مذکورہ بالا آیت میں بتا دیا گیا ہے۔ اور شیاطین کے دوست وہ ہوتے ہیں جو قرآن اور سنّت کو چھوڑ کر غیر کی پیروی اختیار کرتے ہیں مثلاً فلاسفہ، معتزلہ، نیچری وغیرہ۔ لیکن یہاں ذکر ہو رہا ہے اولیار اللہ کا جن کی زندگیاں اتباعِ سنّت اور حکم خداوندی کے تحت بسر ہوتی ہیں۔ جن کا ہر فعل رضائے الٰہی کے لیے ہوتا ہے۔ جن کا مقصود صرف ذات باری تعالیٰ ہے۔ ان کے دل محبت الٰہی سے لبریز اور ان کی آنکھیں خشیتِ الٰہی سے نم ناک ہوتی ہیں۔ جو مخلوق کے دکھ درد میں غمگین اور ان کے دلوں کو راحت پہنچانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ امام ابن قیمؒ

۵۔ قرآن کریم۔ سورۂ آل عمران ۶۴۔

۶۔ توحید کیا ہے ترجمہ کشف الشبہات فی التوحید، محمد بن عبد الوہاب۔ مترجم عطار اللہ ثاقب۔ مکتبہ ترجمان دہلی۔ ۱۹۹۵ء۔

۷۔ اسوۂ حسنہ ترجمہ ہدی الرسولؐ مترجم مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی۔ اختصار زاد المعاد فی ہدی خیر العباد۔ مکتبہ ترجمان دہلی

Marfat.com

جوزیؒ نے قرآن اور احادیث کی روشنی میں ایسے اشخاص کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اعمال دیکھو تو نظر آئے گا کہ وہ اللہ واحد کی پرستش کرتا ہے، کسی کو اس کے ساتھ شریک نہیں کرتا، اس کی مرضی کو اپنی ہوا و ہوس پر مقدم رکھتا ہے، اس کی مخلوق کے ساتھ حتی المقدور نیکی کرتا ہے سب کے ساتھ اس کا برتاؤ وہی ہے جو اپنے لیے چاہتا ہے۔ یہی حال اخلاق میں بھی ہوگا۔ اعلیٰ ترین اخلاق سے اس کا نفس آراستہ ہوگا۔ علم، رحم، صبر، صدق، محبت، شجاعت، عفت، سخاوت، انسانیت رواداری، قلب کی سلامتی، مومنین کے ساتھ فروتنی، دشمنانِ الٰہی پر نخوت و سختی، غرض تمام محاسن اخلاق سے متّصف ہوگا کہ جن کی تحسین پر تمام شرائع ربّانی فطرت و عقلِ انسانی متفق ہیں۔ اور ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن کریم میں آیا ہے (۱۶ : ۳۲)

قرآن، حدیث نیز اجلّ علمار اور ائمہ کے اقوال کی روشنی میں اولیار اللہ یا صوفیار کے اعمال اور افکار کے اس جائزے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی عبادتوں اور ریاضتوں کا مقصود نظر کیا ہے۔ کیا جنت کی بشارت، یا دوزخ سے نجات یا دنیا والوں کی نظروں میں افتخار و بلندی مقصود ہے لیکن صوفیار کی سوانح اور ان کے اقوال کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کے نزدیک ان چیزوں کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اکابر اولیار اللہ کے ملفوظات اور واقعات کے غائر مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ذکر و فکر کا حاصل رضائے الٰہی اور قربِ خداوندی ہے۔ قربِ خداوندی اور معیّت الٰہی کی جستجو ہی حاصلِ کائنات ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جو شئے موجود ہو اور نظر نہ آتی ہو اس کی تلاش ہوتی ہے۔ یہاں تو معاملہ ہی مختلف ہے هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔

اور پھر فرمایا وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْد

حدیث شریف میں وارد ہے۔ ابن عمرؓ نے فرمایا کہ فرمایا رسولِ خدا نے جب تم میں کوئی نماز پڑھے تو اپنے روبرو نہ تھوکے کیونکہ حق تعالیٰ اس کے روبرو ہے۔

(مالک، موطا، بخاری)

Marfat.com

حضور حق ہر جگہ ہے فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ۔ تم اپنا منھ جدھر پھیروگے وہیں ہے ذات اللہ کی۔

القصہ مختصر قرآن اور حدیث کی روشنی میں معیت الٰہی ثابت اور قرب الٰہی بھی روشن ہے اسی لیے ایک صوفی کہتا ہے

جگ میں آکر ادھر اُدھر دیکھا　　　تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

لیکن اس کو محسوس کرنے کے لیے دل اور دیکھنے کے لیے آنکھ درکار ہے۔ اور اولیاء اللہ وہی آنکھ اور دل تیار کرتے ہیں۔ دل کو صیقل کرنے اور آنکھ کو دیدارِ الٰہی کی تمنائی بنانا ہی ان کی زندگی کا منہاج ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے چند اصولوں پر کاربند نظر آتے ہیں۔ عیال اللہ یعنی مخلوق کی خدمت اور دل جوئی۔ اتباعِ سنت۔ حبِّ رسول۔ غیر اللہ کی محبّت کو دل سے ختم کرنا۔ اللہ کے لیے جینا، اُسی کے لیے مرنا۔ یہی وہ بنیادی اصول ہیں جن کے ذیل میں ساری چیزیں آتی ہیں۔ ذرا اکابر اولیاء اللہ کی سوانح اور ملفوظات بالخصوص ہندوستان کے اولیاء کرام میں سے چند اکابر صوفیا کی زندگی کا جائزہ لیجئے تو یہ صورت حال اور واضح ہو جاتی ہے۔ تیرہویں صدی کے مشہور بزرگ عارف باللہ خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے چند ملفوظات پیش کیے جاتے ہیں۔

نماز رکنِ دین ہے اور رکن وستون مترادف ہیں، اگر ستون قائم رہے گا گھر کھڑا رہے گا اور جب ستون ہی گر جائے گا گھر گر پڑے گا۔ جس نے نماز میں خلل ڈالا اس نے دین اور اسلام کو خراب کیا۔ نماز اور شریعت کا منکر کافر ہے مومن وہ شخص ہے جو تین چیزوں کو دوست رکھتا ہے۔ درویشی، بیماری، موت۔ حاجت مندوں کی مدد کرنے والا اللہ کا دوست ہے۔ اگر کوئی شخص اوراد و وظائف میں مشغول ہو اور کوئی حاجت مند آئے تو لازم ہے کہ وہ اوراد و وظائف چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو۔ روزہ اور حج کی فضیلت بہت بیان فرماتے تھے خود صائم الدہر رہے اور بہ کثرت خانۂ کعبہ کی زیارت فرمائی۔

Marfat.com

کلام پاک کی تلاوت کثرت سے فرماتے تھے اس کی بڑی فضیلت بتائی ہے۔ منجملہ عبادتوں کے خواجہ صاحب نے اہلِ سلوک کو پانچ عبادتیں بتائیں ہیں ۱۔ والدین کی خدمت۔ ۲۔ کلام اللہ کی تلاوت۔ ۳۔ علماء و مشائخ کی تعظیم اور دوستی۔ ۴۔ خانۂ کعبہ کی زیارت۔ ۵۔ پیر کی خدمت۔

ان تمام ریاضت اور عبادت کے بعد نمبر آتا ہے عارف کا۔ عارف کے متعلق خواجہ صاحب نے فرمایا۔ عارف عشقِ الٰہی میں کھو جاتا ہے اور اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اسی کی قدرتِ کاملہ میں محو اور متحیر رہتا ہے۔

عبادت کے لیے تین ارکان ضروری ہیں۔ ہیبت، تعظیم، حیا۔ اپنے گناہوں سے شرمندہ ہونا ہیبت ہے۔ طاعت گزاری تعظیم ہے۔ اور خدا کے سوا کسی پر نظر نہ ڈالنا حیا ہے۔ عارف کی محبت یہ ہے کہ ذکرِ حق کے سوا کسی چیز سے لگاؤ نہ رکھے۔

محبتِ رسول کا یہ عالم رہا کہ تمام عمر عشقِ الٰہی اور محبتِ رسول میں سرشار رہے۔ اپنے ملفوظات میں حضور اکرمؐ کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرتے ہیں۔ اکثر حدیثِ نبویؐ بیان فرما کر رونے لگتے اور روتے روتے بے ہوش ہو جاتے۔ ایک بار فرمایا۔ افسوس ہے اس شخص پر جو قیامت کے دن آپ سے شرمندہ ہوگا۔ اس کی جگہ کہاں ہوگی جو آپ سے شرمندہ ہوگا۔ وہ کہاں جائے گا[۸]

یہی سبب تھا کہ خواجہ صاحب کی رحلت کے بعد پیشانی پر یہ لفظ نمودار ہو گئے تھے۔ حبیب اللہ مات فی حب اللہ[۹]

خواجہ صاحب ہی کے عہد کے ایک اور مشہور بزرگ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانیؒ کے اوصافِ حمیدہ اور اذکارِ محمودہ کتب سیر اور تاریخ میں محفوظ فرماتے تھے، بدن کی سلامتی قلتِ طعام میں اور روح کی سلامتی ترکِ گناہ میں اور دین کی سلامتی حضرت خیر الانام محمد صلے اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے میں

۸۔ دلیل العارفین۔ سیر الاقطاب۔

۹۔ اخبار الاخیار، عبدالحق محدث دہلوی ۲۳ مطبع مجتبائی۔ دہلی ۱۳۳۲ھ

Marfat.com

ہے۔ مرید کو چاہیے کہ اپنے روزگار کی حفاظت کرتا رہے، ماسوا اللہ کو دل سے دور کر دے۔ دنیا کی محبت کو اپنے اوپر حرام کرے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے موانست نہ ہو گی تو خدا تعالیٰ کی محبت کی بو بھی نہ سونگھ سکے گا۔ پھر فرمایا: ہر قول و فعل سے پہلے اللہ تبارک تعالیٰ سے التجا کرے اور اس سے نیک عمل کی توفیق کی مدد چاہے۔ آپ نے اپنی تمام زندگی انھیں اصولوں کے تحت بسر کی۔ اسی لیے ان کے وصال کے وقت ایک صدائے غیبی سنائی دی۔ "دوست بہ دوست رسید" اور اس طرح قرب خداوندی کی دولت حاصل کی۔

عہدِ سلاطین دہلی کی برگزیدہ شخصیت محبوبِ خلائق حضرت نظام الدین محبوبِ الہیؒ کی ساری زندگی ان ہی اصولوں کی پیروی اور اشاعت و تبلیغ میں گزری۔ ان کے عہد کے مورخین بیک زبان یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ آپ کے نفسِ مبارکہ کی برکت سے ایک عالم نے لہو و لعب سے توبہ کی، اتباعِ سنت اور ارکانِ اسلام کا دور دورا ہوا۔ آپ کے ملفوظات کا مصدقہ مجموعہ "فوائد الفواد" شائع ہو چکا ہے اور تشنگانِ شرابِ معرفت کے لیے میکدۂ سرور ہے۔ فرمایا آپ نے: طاعت کی دو قسمیں ہیں ایک لازمی دوسری متعدی۔ طاعت لازمی یہ کہ اس کا نفع صرف اطاعت کرنے والے کو پہنچے، وہ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔ طاعت متعدی یہ ہے جس کی منفعت دوسروں کو بھی پہنچے۔ اس کا ثواب بے شمار ہے۔ اسی سلسلے میں شیخ ابوسعید ابوالخیر قدس سرہٗ کا قول نقل فرماتے ہیں کہ آپ (ابوالخیرؒ) نے فرمایا یوں تو کائنات کا ہر ذرہ حق تعالیٰ کی طرف رہنمائی کرتا ہے لیکن کوئی راستہ قریب تر دلوں کو راحت پہنچانے سے نہیں۔ ہم نے جو کچھ پایا اسی راہ سے پایا میں اس کی وصیت کرتا ہوں، اس سلسلہ میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدینؒ نے بہت سے واقعہ نقل کیے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے اپنی ساری زندگی طاعت لازمی اور طاعت متعدی کو بہتر طریق پر ادا کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ بقول مصنف سیر اولیاء تمام عمر صائم الدہر رہے۔ دن رات میں چار پانچ سو رکعتیں نماز پڑھا کرتے تھے۔

Marfat.com

اور خانقاہ میں کوٹھے پر ان کا قیام رہتا تھا۔ مگر اسّی سال کی عمر میں کوٹھے سے اتر کر نماز باجماعت ادا کرتے۔ روزانہ کا یہ معمول تھا۔ فجر و اشراق اور چاشت کی نمازوں کے بعد جماعت خانہ میں مسند رشد و ہدایت پر جلوہ فرماتے۔ علمار صلحار اور صوفیا کا اجتماع ہوتا اور وہ سلوک و معرفت کے وقائع بیان فرماتے۔ اس اثنار میں شہر سے غربار و مساکین آتے رہتے، ان کو پیسے، غلہ اور تحفے دیے جاتے۔ حکم تھا کہ خانقاہ کی ساری چیزیں غربار میں روز تقسیم کر دی جائیں۔ کوئی چیز باقی نہ رہنے پاتے۔ ظہر کی نماز سے پہلے قیلولہ فرماتے۔ ظہر کی نماز کے بعد پھر مجلس ہوتی اور اس مجلس میں حضور محبوب الٰہیؒ زیادہ تر علمی نکات بیان فرماتے۔ حدیث کشاف اور دوسری کتابوں کا درس بھی ہوتا۔ محبت رسولؐ کا یہ عالم تھا کہ رسول اکرمؐ کی ہر سنت ان کو دل و جان سے پیاری تھی۔ وفات سے چالیس دن پہلے حضور اکرمؐ کو خواب میں دیکھا تھا کہ فرما رہے ہیں نظام تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے، بس اسی روز سے سفر آخرت کے لیے بے چین ہو گئے۔ آخری دنوں میں نماز کا وقت آتا تو ایک ہی وقت کی نماز کئی کئی بار پڑھتے، زبان مبارک سے فرماتے۔ می رویم می رویم می رویم۔

حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے علاوہ اس میکدۂ معرفت میں جلال الدین بخاری مخدومؒ جہانیاں جہاں گشت، سید شرف الدین یحییٰ منیری اور سید جہانگیر اشرف رحمۃ اللہ علیہ کے نام بالخصوص لیے جا سکتے ہیں۔ ان سب صوفیار کے ذکر کے لیے دفتر چاہیے۔ لہٰذا آخر میں، میں انیسویں صدی کے مشہور و معروف بزرگ بندۂ مولا صفات سیدنا حاجی حافظ وارث علی شاہ اعظم اللہ ذکرہ کے چند ملفوظات اور معمولات کا ذکر کر کے اپنی بات ختم کروں گا۔ آپ نے فرمایا: نماز پڑھو، نماز سے نظام عالم قائم ہے۔ جو نماز نہیں پڑھتا وہ ہماری بیعت سے خارج ہے۔ فقیر وہ ہے جو کسی سے کچھ نہ مانگے۔ محبت کرو۔ محبت میں سب کچھ ہے۔ آپ کا دربار بلا تفریق مذہب و ملت سب کے لیے کھلا تھا۔ الخلق عیال اللہ کے پیش نظر آپ کے یہاں مفتی ابوذر صاحب سے لے کر ٹھا کر پنچم سنگھ تک میخانۂ وارثؒ سے سرشار ہوتے

Marfat.com

تھے۔ تمام عمر صائم الدہر رہے۔ مال دنیا کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا۔ خدام سارا کاروبار سنبھالتے تھے۔ جو بھی فتوح آتی شام تک غربا، مساکین اور اہلِ حاجت میں تقسیم ہو جاتیں۔ عشقِ الٰہی اور محبتِ رسول میں پانچ بار زیارتِ کعبہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے۔ حضرت وارث علی شاہؒ تسلیم و رضا پر بہت زور دیتے تھے ایک بار فرمایا۔ فقر یہ ہے کہ ہر حال میں مالک کی مرضی پر راضی رہے۔ آپ کبھی انتقام کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ متعدد واقعات ایسے ہوئے کہ آپ نے فرمایا کہ بخش دینا اللہ کے نزدیک محبوب عمل ہے۔ اور آپ کے معتقدین نے باوجود طاقت کے شرپسندوں کو معافی دے دی۔ گویا ؎ کاسۂ شر ہیں قاتل کو پلانے والے

تصوّف اور اہل اللہ کے اس مختصر سے تعارف کے ساتھ 'خود آگہی' کی شکل میں میری حقیر کاوش آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ حق تو یہ ہے کہ طریق اہل باطن اور معرفت حق پر گفتگو کرنا کاملین کا حصّہ ہے۔ میرے جیسے ناقص تو ان لوگوں میں ہیں جنھیں اپنی ہی خبر نہیں۔

ان خود نوشتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے بعض مقامات پر خود نوشت نگار کی رائے اور چند مقامات پہ پیش کردہ حقائق سے تجزیہ کی بنیاد پر انحراف کیا گیا ہے۔ یہ انداز خالصتاً علمی ہے اس میں ان بزرگوں کی عظمت اور ان کے مراتب پر کوئی حرف نہیں آتا۔

من خاکِ کفِ پائے رندانِ خراباتم

خاکسار

وہاج الدین احمد علوی

Marfat.com

Marfat.com

تذکرۂ غوثیہ

تذکرہ غوثیہ اردو کی ایسی تخلیق ہے، جس کے بارے میں ابھی تک طے نہیں ہو پایا کہ اس کی ہیئت اور صنف کیا ہے۔ اس کتاب میں بہ یک وقت خودنوشت، تذکرہ نگاری اور سوانح نگاری کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس کے مؤلف سید غوث علی شاہ قلندر کے خلیفہ شاہ گل حسن ہیں لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ اس کی تالیف مولوی اسمٰعیل میرٹھی کی طبع سلیم کی رہین منت ہے۔ مجھے اس قسم کا کوئی ثبوت نہ مل سکا جس کی بنا پر اس کتاب کو اسمٰعیل میرٹھی سے منسوب کیا جا سکتا۔ اس لیے جب تک یہ بات پایۂ ثبوت کو نہ پہنچ جائے، تذکرہ غوثیہ کو شاہ گل حسن سے ہی منسوب کرنا ادبی دیانت داری کے عین موافق ہے۔ کتاب میں داخلی شواہد بھی اس بات کی توثیق کرتے ہیں کہ اس کی تالیف شاہ گل حسن کے موئے قلم کا کارنامہ ہے۔ چنانچہ کتاب کے سبب تالیف پر مولف نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

ابتدائے حال سے حضرت قبلۂ عالم کو کبھی تصنیف و تالیف منظور نہ ہوئی۔ عالمِ بے نشانی مدنظر رہا۔ پابندی و تقلید سے طبع آزاد و نفور تھی جو اشعار و نکات یا رموز و اسرار کہ وقتاً فوقتاً زبان فیض ترجمان پر جوشش دریائے غیب نے جاری کیے یا تعلیم و تلقین اصحاب کے اقتضا سے اظہار و بیان میں آئے بعض ارادت مندوں نے تحریر و تالیف کی اجازت مانگی تو زنہار مرضی مبارک کا میلان اس طرف نہ پایا۔ نقش اوّل و آخر کو کف دست سے مٹایا۔ البتہ آخری ایام میں اس خاکسار کو ازراہ عنایت صرف اتنی اجازت حاصل ہوئی کہ اشعار و مقالات اشلوک و دوہے و چوپائی وغیرہ جو ارشاد مبارک ہیں حسب موقعہ وارد ہوتے تھے۔ یہ کمترین یادداشت کے لیے فوراً تحریر کر لیتا تھا۔ بجز اس کے کوئی حرف و حکایت یا نقل و روایت سوائے

Marfat.com

سماعت کے سپرد قلم نہیں کی گئی یا[۵]

اس اقتباس سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ تذکرۂ غوثیہ شاہ گل حسن شاہ کی تالیف ہے اور حضرت غوث علی شاہ قلندر کی شخصیت، حیات، واقعات اور واردات کو صیغۂ واحد متکلم میں بیان کیا گیا ہے جو خود نوشت کا طرۂ امتیاز ہے۔ مؤلف نے واقعات کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے افسانوی اسلوب اختیار کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس میں داستان نگاری کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ چونکہ اس میں خود نوشت کے کچھ عناصر بھی پائے جاتے ہیں اور مولف نے اس بات پر زور دیا ہے کہ غوث علی شاہ قلندر نے جو کچھ اپنی زبان سے اپنے بارے میں بتایا، وہی ان کی زبان میں صیغۂ واحد متکلم میں تحریر کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ خود نوشت کے ذیل میں شامل ہو سکتی ہے۔ تذکرہ غوثیہ کے مرکزی کردار غوث علی شاہ قلندر ہیں جن کو فقرائے متاخرین میں ایک مقام حاصل ہے اور اس سلسلہ کی یہ قدیم کتاب ہے

اس کتاب میں چھ ابواب ہیں۔ پہلے باب میں دو فصل ہیں۔ (۱) حال آبا و اجداد۔ (۲) حال اخوان و بنی اعمام۔ دوسرا باب ولادت اور تربیت پر مشتمل ہے اس باب میں تین فصل ہیں۔ (۱) حال ولادت و تربیت (۲) حال تحصیل و تکمیل علم (۳) کیفیت بیعت۔ تیسرا باب سیاحت کے بیان میں ہے۔ اس باب میں ایک سو ساٹھ ارشادات نقل ہوئے ہیں۔ چوتھا باب توحید کے بیان میں ہے۔ اس باب میں چار فصل ہیں (۱) تعریف و تقسیم توحید (۲) آیات و احادیث مشتمل بر توحید (۳) مقالات اہلِ توحید (۴) آثار و اطوار اہلِ توحید، پانچواں باب تین سو ستّر ارشادات پر مشتمل ہے۔ چھٹا باب دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ (۱) کیفیت اوقات شریف و خصائل و شمائل (۲) ذکر وصیت و حالات وصال۔

تذکرہ غوثیہ کے اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ غوث علی شاہ قلندر حسنی سید تھے اور

---

[۵] تذکرہ غوثیہ آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی، بار پنجم ۱۹۶۵ء ص ۴

۷۳۵۷۷

Marfat.com

حضرت غوث اعظم کے انیسویں پشت میں تھے۔ آپ کی دسویں پشت میں حضرت محمد غوث الحسینی جلبی جیلانی روم سے خراسان اور خراسان سے ملتان ہوتے ہوئے اوچھو (سندھ) پہنچے۔ اس طرح یہ خاندان ہندوستان آیا۔ شاہ صاحب کے دادا سید ظہور الحسن سندھ سے ترک وطن کر کے مونگیر (صوبہ بہار) میں آئے اور وہیں کے ہو رہے[1]۔ غوث علی شاہ کی ولادت جمعہ کے دن، ۷ دسمبر ۱۸۰۴ء کو ہوئی۔ گل حسن شاہ نے تحریر کیا ہے:-

"بتاریخ ۲۴ یا ۱۱ یا ۲۵ ماہ رمضان المبارک، ٹھیک تاریخ راقم کو یاد نہیں رہی ۱۲۱۹ھ مطابق ۱۵ اگہن ۱۸۶۱ ہندی ۱۴۰ اگہن ۶۱-۱۴ فصلی ۲۴ اگہن ۱۲۱۲ بنگلہ ۷ دسمبر ۱۸۰۴ء بروز جمعہ وہ بلبل بوستان توحید سرو گلستانِ تفرید شہبازِ اوجِ حقیقت تاجدارِ کشورِ معرفت شہسوار عرصۂ فقر و فنا خضر راہِ خدا منزل شناسِ ہر طریق سلطان ممالک تحقیق، مردِ میدانِ ترک تجرید، نغمہ سنج قانونِ عشق و توحید، آفتاب انوار الٰہی، سرچشمۂ فیض لامتناہی یعنی حضرت مرشدی و مولائی قبلۂ عالم و عالمیان کعبۂ جان و جہانیان سید غوث علی شاہ قلندر قادری مثلِ آفتاب جہان تاب جلوہ فرمائے مطلع ظہور ہوئے[2]۔

اس بیان سے یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ یہ تاریخیں مؤلف کو کہاں سے ملیں۔ مؤلف نے دوسری روایات کی طرح اس بیان میں یہ کہیں نہیں کہا کہ ایک روز ارشاد ہوا۔ غوث علی شاہ کی والدہ ماجدہ کو ایک قسم کا جنون تھا وہ بچہ کی پوری طرح نگہداشت سے قاصر تھیں۔ اس لئے انھیں پنڈت جی رام سنیہی کی زوجہ نے دودھ پلایا اور ابتدائی پرورش میں حصہ لیا۔ وہ چار برس چار ماہ کے ہوئے تو حسب دستور بسم اللہ پڑھائی گئی اور پنڈت رام سنیہی نے شاستر کی شروعات کرائی۔ انھوں نے دس بارہ برس کی عمر میں قرآن نصف حفظ کر لیا۔ فارسی میں سکندر نامہ وغیرہ چند کتابیں پڑھیں۔ پنڈت جی سے سنسکرت کی تعلیم حاصل کی۔ اس طرح عربی فارسی اور سنسکرت سے اچھی خاصی واقفیت ہو گئی۔

[1] تذکرۂ غوثیہ ص ۶ [2] تذکرۂ غوثیہ ص ۱۳

Marfat.com

اس کے بعد ان کے والد احمد حسن نے انھیں دہلی بلا لیا۔ یہاں مولوی اسمٰعیل، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور مولوی فضلِ حق خیرآبادی وغیرہ سے علم حاصل کیا۔ حسبِ دستور خاندان پہلے اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت ہوئے پھر دوسرے سلاسل میں بیعت کی۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیّد غوث علی شاہ قلندر نے دینی اور مذہبی تعلیم میں ایک خاص دستگاہ بہم پہنچائی تھی اور ابتداء سے ہی سلوک کی منزلیں طے کرنے کی کوشش کی تھی۔

تذکرۂ غوثیہ میں کشف و کرامات کے واقعات تفصیل سے ملتے ہیں۔ ان قصوں کو اگر صرف عقل کی میزان پر دیکھا جائے تو اس کا سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ لیکن جب مذہب اور ایمانی بصیرت کی روشنی میں دیکھا جاتا ہے تو یہ ساری باتیں بالکل حق معلوم ہوتی ہیں۔ خداوند کریم نے انبیا کو معجزہ اور اولیاء اللہ کو کرامت عطا کی ہیں۔ معجزہ اور کرامت دونوں برحق ہیں چنانچہ حضرت علی ہجویریؒ نے کرامت کے باب میں تحریر کیا ہے:

"واضح رہنا چاہیے کہ صحیح طور پر مکلف ہونے کی حالت میں ولی پر کرامت کا ظہور جائز ہے اہلِ سنت وجماعت کے دونوں فریق یعنی علماء و مشائخ کا اس پر اتفاق ہے اور عقل کے نزدیک بھی یہ محال و ناممکن نہیں ہے اس لیے کہ از قسم قدرت الٰہی ہے ....
.... کرامت وہ ایک فعل ہے جو انسانی عادتوں کو اس طرح عاجز کر دے کہ اس کی تکلیف کی حالت باقی رہے[۱۳]"

حضرت علی ہجویریؒ نے یہ بات واضح کر دی کہ ولی پر کرامت کا ظہور جائز ہے اور وہ اس پر قادر ہوتا ہے۔ کرامت کی تعریف سے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ اس کے ظہور سے عقلِ انسانی پریشان ہو جاتی ہے اور یہ بات خلافِ عادت ہوتی ہے۔ کرامت کے جواز کے سلسلہ میں وہ حدیث قدسی بھی پیش کی جاتی ہے جس میں ارشادِ ربی ہے کہ ہم جس بندے کو اپنا محبوب بنا لیتے ہیں تو ہم اس کے ہاتھ ہو جاتے ہیں، اس کے کان بن جاتے ہیں۔ جب خداوند قدیر خود ارشاد فرماتا ہے تو پھر ایسے بندے کا ہر فعل بظاہر

[۱۳] کشف المحجوب مترجم مفتی حکیم غلام معین الدین نعیمی، نوری بک ڈپو، لاہور، ص ۲۹۶-۲۹۵

Marfat.com

اس بندے کا فعل نظر آتا ہے لیکن درپردہ قدرت خداوندی کارفرما ہوتی ہے۔ اس لیے اولیاء اللہ سے خرق عادات اور کرامات کا سرزد ہونا خلافِ عقل سہی، لیکن ناممکن نہیں ہے۔ تذکرۂ غوثیہ سے یہاں صرف دو واقعات درج کیے جاتے ہیں:

"ایک بار تمام خادمان درگاہ حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ کے عرس میں چلے گئے تھے وہاں سوائے ہمارے اور کافر شاہ مجذوب کے کوئی نہ تھا۔ وہ عارضۂ اسہال میں مبتلا تھے ایک دن ہم سے کہا کہ اب میرا وقت قریب آگیا ہے، میرا بدن اور کپڑے سب ناپاک ہیں، کپڑے تو تالاب پر دھولاؤ اور مجھ کو نہلا دو۔ ہم نے کپڑے دھوئے اور ان کو خوب نہلایا۔ بعد نماز مغرب چادر تان کے لیٹ گئے اور السلام علیکم کہہ کر جاں بحق ہوئے اس زمانے میں مزار کے آس پاس بہت جنگل تھا ہم ان کی لاش کی نگہبانی کرتے رہے جب آدھی رات گزری تو خیال آیا کہ اب لاش کو تنہا چھوڑتے ہیں تو خوف ہے کہ کوئی جانور نہ کھا جائے اور نہیں جاتے ہیں تو نماز قضا ہوئی ـــــ ہم اسی فکر میں تھے کہ مجذوب الا اللہ کہہ کر اٹھ بیٹھے۔ ہم نے لاحول پڑھی اور اپنا ڈنڈا سنبھالا کہ شاید کوئی بھوت لاش کے اندر حلول کرگیا ہے۔ مارنے کا ارادہ کیا تھا کہ وہ گھبرا کے بولے میاں غوث علی شاہ خبردار کوئی جن بھوت نہیں ہوں وہی کافر شاہ ہوں جو تم فکرمند تھے اس لیے میں سرکار سے دوپہر کی رخصت لے کر آیا ہوں ـــــ اب تم جاؤ نماز پڑھو میں دو گھڑی دن چڑھے مروں گا۔" [۱۴]

ـــ یا ـــ

"فرمایا کہ ہم کو ایک نقل یاد آئی جب حضرت عبدالقدوس گنگوہی رحمت اللہ علیہ نئی فقیری حاصل کرکے گھر میں تشریف لائے تو اتفاقاً قحط ہو گیا ـــ آپ نے ایک دیگ

۱۴؎ تذکرۂ غوثیہ ص ۳۳

Marfat.com

پلاؤ کی مسلمانوں کے واسطے باورچی سے ایک دیگ موہن بھوگ کی ہندوؤں کے واسطے برہمن سے پکوائی اور شہر میں منادی کرادی کہ تمام ہندو مسلمان آئیں اور کھائیں ۔ دیگوں کا حال یہ تھا کہ جتنا کھانا دیگ میں سے نکالتے تھے پھر اسی قدر ہو جاتا تھا اور ہر دم گرما گرم تین دن تک یہی حال رہا چوتھے روز الہام ہوا کہ عبدالقدوس فقیری تو کر چکا اب رزاقی میں بھی قدم رکھنے لگا ۔ بھلا ہم پوچھتے ہیں کہ تم کون ہو عرض کیا تیرا بندہ بھلا وہ لوگ کون ہیں کہا تیرے بندے، حکم ہوا کہ پھر تو کون ہے دخل دینے والا، کیا ہم سے زیادہ حکمت والا یا ہم سے زیادہ مخلوق پر مہربان ہے ۔ اس کے بعد شاہ عبدالقدوسؒ نے توبہ کی اور دیگیں توڑ ڈالیں ،، [۱۵]

مندرجہ بالا دونوں واقعات اپنی نوعیت کے لحاظ سے بعید از عقل واقعات ہیں ۔ پہلا واقعہ موت وحیات پر تصرف کا ہے ۔ دوسرا واقعہ شان رزاقی کا مظہر ہے لیکن دونوں واقعوں سے پتہ چلتا ہے کہ خداوندکریم اپنے بندوں کو خاص روحانی قوت عطا کر دیتا ہے لیکن جہاں اس کی مصلحت سے بندے کے تصرفات یا کرامت ٹکراتی ہے، وہ جواب طلب کر لیتا ہے ۔ اسی لیے فقیر کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ فقیر وہ ہے جو ہر حال میں مرضیِ مولا کا پابند ہو ۔ اور روحانی قوت رکھتے ہوئے بھی اس کے مظاہر سے پرہیز کریں ۔

تذکرۂ غوثیہ میں حضرت غوث علی شاہ کی زبانی تصوف کے اسرار اور شریعت کے رموز کا دلکش بیان ملتا ہے ۔ خاص طور پر توحید کے مسئلہ پر کھل کر بحث کی گئی ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ توحید کی چار اقسام ہیں (۱) توحید شریعت (۲) توحید طریقت (۳) توحید ذاتی (۴) توحید معرفت ۔ پھر ان چاروں اقسام کی تعریف بیان کی گئی ہے اور ان کے اقسام در اقسام کا ذکر بھی کیا گیا ہے ۔ حضرت غوث علی شاہ

---

۱۵ تذکرۂ غوثیہ ص ۲۸۶

Marfat.com

قلندر کے نزدیک توحید کی تعریف یہ ہے:

"توحید کے معنی ہیں شے کے واحد ہونے پر حکم کرنا اور شے کے واحد ہونے کا علم بھی توحید ہے۔ اکابر صوفیاء نے طرح طرح سے اس کی توضیح اور تقسیم کی ہے جب جیسا علم وانکشاف ہوا اس کے موافق بیان فرمایا"۔[16]

توحید پر علماء اور صوفیاء نے ہر عہد میں اظہار خیال کیا ہے۔ حضرت سید علی ہجویری داتا گنج بخشؒ نے لکھا ہے:

"توحید کی حقیقت یہ ہے کہ کسی چیز کو اکیلا جاننا اور اکیلے جاننے پر صحیح علم رکھنا اس کا نام توحید ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ ایک ہی ہے بے مثل ہے وہ اپنی ذات اور صفات میں بے نظیر اور اپنے افعال میں لاشریک ہے موحدین نے اللہ تعالیٰ کو انھیں خوبیوں کے ساتھ جانا اور اس جاننے کو توحید کی یکتائی کہتے ہیں"۔[17]

بنیادی طور پر توحید کے تصورات کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے تمہارا معبود ایک ہی ہے (تم فرمادو وہ اللہ اکیلا ہے) اور تم دو معبود نہ بناؤ بلاشبہ وہ معبود ایک ہے۔ ان ساری تعریفوں سے واضح ہوتا ہے کہ صوفیاء نے توحید کی جو اقسام بیان کی ہیں وہ تمام وکمال قرآن اور احادیث سے اخذ کی گئی ہیں۔ حضرت سیّد علی ہجویریؒ نے خدا کی ذات کو صرف اکیلا جاننا ہی کافی نہیں سمجھا بلکہ اس کی ذات کے اکیلا ہونے کا علم رکھنا تصور توحید کا لازمی عنصر قرار دیا۔ غوث علی شاہ قلندر نے صرف شے کے واحد ہونے کے علم کو توحید کہا ہے۔ اس طرح حضرت علی ہجویریؒ نے توحید کی تین اقسام بیان کی ہیں (۱) حق تعالیٰ کی توحید اسی کے لیے (۲) حق تعالیٰ کی توحید مخلوق کے لیے (۳) مخلوق کی توحید خدا کے لیے۔[18] اسلام میں تصور توحید کے آغاز وارتقا میں توحید شہودی اور توحید وجودی کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر عنوان چشتی نے تصور توحید کے مدارج اور ارتقا

---

[16] تذکرہ غوثیہ صفحہ ۱۰۶ [17] کشف المحجوب، صفحہ ۳۶۸ [18] کشف المحجوب، صفحہ ۳۶۸

Marfat.com

پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :۔

"اسلام کا بنیادی اصول توحید ہے۔ توحید کی چار اقسام ہیں ــــ ایمانی، علمی، حالی اور الٰہی۔
توحید ایمانی کی فلسفیانہ تعبیر کا نام توحید وجودی ہے۔"[۱۹]

ڈاکٹر عنوان چشتی نے توحید شہودی کو تصور توحید کی ابتدائی اور سادہ اور توحید وجودی تصور توحید کی آخری اور فلسفیانہ تعبیر قرار دیا ہے۔ اس بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تصور توحید کے مختلف انسانوں اور ذہنوں کے مطابق ہیں۔ جس کی بنیاد لا الٰہ الا اللہ پر ہے جس کو صوفیا، لا محبوب الا اللہ لا مطلوب الا اللہ، لا معبود الا اللہ اور لا موجود الا اللہ کہتے ہیں۔ سید غوث علی شاہ قلندر کے تصور توحید کا لب لباب یہ ہے: "بعض توحید وجودی کے قائل ہیں بعض شہودی کے بعض اتحادی ہیں۔ بعض حلولی کوئی غیبی ہے کوئی ظلی، کوئی اوست کا قائل ہے کوئی ازوست کا، کوئی ہمہ اوست کا چنانچہ شیخ عطار فرماتے ہیں:

او چو خورشید است ما چوں سایہ ایم
ہیچو نور و سایہ ما ہمسایہ ایم

لیکن بہتر یہ ہے کہ جو کچھ عبادت وطاعت، زہد و ریاضت انسان کرتا ہو انسان اس میں لگا رہے۔ اہل شریعت کو ورع اور تقوی اور صوم وصلوٰۃ اور اہلِ طریقت کو اپنے ذکر وفکر میں مشغول رہنا چاہئے کیونکہ راز بطون نہ کسی پر ختم ہوا نہ کسی پر ہے۔"[۲۰]

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ توحید کے مسئلہ میں فضول بحث سے احتراز کرنا چاہیے۔ اور فضول انداز کے اختلافات میں نہیں الجھنا چاہیے۔

غوث علی شاہ قلندرؒ نے صوفیوں کے مختلف سلسلوں کی تعلیمات اور طریقوں کا ذکر

---

[۱۹] ماہنامہ برہان، دہلی، جلد نمبر ۸۷ شمارہ نمبر ۳ ستمبر ۱۹۸۱ء صہ ۵۴۲
[۲۰] تذکرہ غوثیہ صہ ۳۹

Marfat.com

بھی کیا ہے جس سے بہت سے امتیازات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ انھوں نے ریاضتوں کا ذکر کرتے ہوئے نقشبندیہ سلسلہ میں دوضربی۔ سہ ضربی۔ شش ضربی۔ پاس انفاس۔ حبس دم۔ اسم ذات، نفی اثبات نظر بر قدم ــــ ہوش دردم وغیرہ کی اہمیت کا خاصا ذکر کیا ہے۔ طریق نقشبندیہ کی تعلیم اور اس کے قدیم طریقے اور جدید کو نقشہ کی مدد سے واضح کیا ہے۔ انھوں نے خاندان چشتیہ اور قادریہ کے ذکر جہر پر روشنی ڈالی ہے۔ جس سے طالب کے ذوق و شوق میں ترقی ہوتی ہے۔ انھوں نے ایک عجیب امتیاز کی طرف اشارہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر ذکر بالجہر سالک سلسلۂ نقشبندیہ یا سہروردیا میں کرتا ہے تو پہلا سا ذوق و شوق بھی جاتا رہتا ہے۔ چونکہ غوث علی شاہ ایک پنڈت کے رضاعی بیٹے بھی تھے اس لیے انھوں نے بچپن ہی میں سادھوسنتوں کی صحبت میں رہ کر ان کے طریقوں کو سیکھ لیا تھا ــــ اور ہندو انداز تصوف سے واقفیت حاصل کرلی تھی۔ مسلمان علماء اور مشائخ میں دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ سخت گیر اور شرع کے ظاہری حدود سے سرمو تجاوز نہیں کرتا اس کے نزدیک جو لوگ اسلام میں نہیں ان کی باتوں کو حاصل کرنا جائز نہیں، لیکن دوسرا گروہ اہل اللہ کا ایسا بھی ہے جو خداوند کریم کے ہر مظہر کو بہ نظر تحسین دیکھتا ہے اور اسے سراہتا ہے اس کے نزدیک دوئی کا وجود ہی نہیں۔ غوث علی شاہ قلندر ایسے ہی فقیر تھے۔ انھوں نے مختلف سنتوں اور جوگیوں کی صحبت سے فائدہ اٹھایا اور ان کی ریاضتوں، عادتوں اور تصورات سے آگاہی حاصل کی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے بہت سے واقعات لکھے ہیں۔ انھوں نے بچپن میں ایک سنیاسی سے چڑھ تاڑی کی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ چڑھ تاڑی کپالی ایک قسم کا شغل ہوتا ہے جس سے روح دماغ میں آجاتی ہے۔ غوث علی شاہ قلندرؒ نے اس میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اپنے رضاعی باپ رام سنیہی کے لیے گنگا اشنان کو گئے تھے۔ وہاں برہم گائتری کا پاٹھ بھی کیا تھا۔ انھوں نے برہم گائتری منتر بھی نقل کیا ہے۔

اوم بھور بھوہ سوہ تت سوی تر ورنیم بھرگو دِوسی دہی مہی دھیو یونہ پرچودیات۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

"اللہ تعالیٰ جو کل مخلوقات میں جلوہ گر ہے اور پرستش کے قابل ہے اس پیداکنندہ کا نور

Marfat.com

سب جانوں میں جلوہ گر ہے۔ ہم فرمان بردار خلوص عقیدت سے یقین کرتے ہیں کہ جو ہمارے حواس خمسہ اور دل و عقل ہیں ان کو اپنی طرف رجوع کریں۔"[۲۱]

برہم گائتری کو نقل کرنے کے بعد غوث علی شاہ نے اپنا خواب بیان کیا ہے، جس میں رسول برحق محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور سری کرشن جی کی مجلس کا ذکر ہے جس میں قلندر صاحب خود بھی حاضر تھے۔ وہاں انھیں کرشن جی نے سمجھایا کہ .... تمہارے یہاں سب کچھ ہے یہاں کیا ڈھونڈتے ہو۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ غوث علی شاہ قلندر زبردست موحد تھے۔ اس سے ان کی وسیع المشربی کا اندازہ ہوتا ہے یہ واقعہ ہے کہ اس کتاب سے مذاہب عالم کی بنیادی اقدار پر روشنی پڑتی ہے اور قومی یک جہتی کو تقویت ملتی ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد عبد و معبود کے رشتے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور طریقت اور شریعت کی راہیں صاف دکھائی دینے لگتی ہیں۔ یہ اردو ادب میں واحد نیم خود نوشت ہے، جس میں دلچسپی کا وافر سامان ہے اور معرفت نیز بھگتی کے اسرار و رموز کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے اسلوب میں بلا کی شگفتگی اور داستانیت ہے۔ اس میں ہندی کے اشلوک اور دوہوں کے برمحل استعمال نے برجستگی اور دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ مولف نے جہاں خود بحثیں کی ہیں یا واقعات درج کیے ہیں وہاں رجب علی بیگ کا اسلوب کارفرما نظر آتا ہے۔ لیکن جہاں جہاں غوث علی شاہ کے ارشادات نقل کئے ہیں، وہاں نہایت سادہ زبان اور بیانیہ اسلوب اپنایا ہے۔ اسلوب کی اس دورنگی سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جو ارشادات غوث علی شاہ کے نقل ہوئے ہیں وہ انھیں کے ہیں وہاں گل حسن شاہ کی حیثیت محض کاتب کی سی ہے۔ تذکرۂ غوثیہ میں حسب موقع اشعار، دوہے، اشلوک، آیات، منتر وغیرہ ملتے ہیں جس سے یہ کتاب ہماری گنگا جمنی تہذیب اور مشترکہ فلسفۂ حیات کا دلکش نقش بن گئی ہے۔

تذکرۂ غوثیہ کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نیم خود نوشت اور نیم سوانح عمری ہے۔ اس کے وہ قصے

---

[۲۱] تذکرہ غوثیہ ص ۱۳۳

Marfat.com

جوگل حسن شاہ نے لکھے ہیں سوانح نگاری کے ذیل میں آتے ہیں۔ لیکن وہ حصے جو صیغۂ واحد متکلم میں ہیں اور سید غوث علی شاہ قلندر کی زبان سے ادا ہوئے ہیں خودنوشت کا انداز لئے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس کتاب میں خودنوشت اور خالص سوانح نگاری دونوں کے اجزا ملتے ہیں۔ تذکرہ غوثیہ کے بنیادی کردار سید غوث علی شاہ کی شخصیت کے حوالے سے ہم ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ ہوتے ہیں۔ اس عہد کی خانقاہوں اور درگاہوں کا علم ہوتا ہے۔ صوفیا اور علماء کے مزاج اور سیرت سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ ہندو تیرتھ استھانوں کے ساتھ سادھو سنتوں کے افکار و اشغال سے شناسائی ہوتی ہے۔ غوث علی شاہ قلندر نے جس واشگاف انداز میں کشف و کرامت کا تذکرہ کیا ہے اور مسلمان فقیروں نیز ہندو سنتوں کے جن روحانی کمالات کا تذکرہ کیا ہے، اس کی مثال دوسری جگہ کم ملتی ہے۔ اس کتاب کا وہ حصہ جہاں سید غوث علی شاہ قلندر نے تصور توحید سے بحث کی ہے، وہاں گہری مذہبی اور روحانی بصیرت ملتی ہے۔ تصور توحید کی وضاحت اس کی اقسام اور مدارج کو عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔ اس کے ساتھ صوفیوں کے مختلف سلسلوں کا دلکش انداز میں تعارف کرایا ہے۔ ان کی تعلیمات اور اشغال کا تذکرہ کیا ہے۔

تذکرہ غوثیہ میں دو اسالیب ہیں۔ ایک گل حسن شاہ کا جو قدیم انداز کا ہے اور دوسرا غوث علی شاہ قلندر کا جو سادہ اور سلیس ہے۔ لیکن مولف جہاں اپنی ترنگ میں آکر خامہ فرسائی شروع کر دیتا ہے وہاں اس کے اسلوب پر داستانوی رنگ غالب آجاتا ہے۔ داستانوی رنگ میں بھی رجب علی بیگ سرور کے اسلوب کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔

مجموعی طور پر تذکرۂ غوثیہ، مکمل خودنوشت نہ ہوتے ہوئے بھی خودنوشت کے عناصر کی حامل ہے۔ یہ کتاب انتہائی دلچسپ اور معلومات افزا ہے ہم اسے اردو میں مذہبی خودنوشتوں کا نقشِ اول کہہ سکتے ہیں۔

Marfat.com

Marfat.com

آپ بیتی

خواجہ حسن نظامی کی شخصیت کئی حیثیتوں سے اردو ادب میں اپنا مقام رکھتی ہے۔ وہ بیک وقت انشاپرداز، صحافی، مصلح اور پیر طریقت تھے لیکن ان کی شخصیت کے رچاؤ میں انشاپردازی اور تصوف کا رنگ زیادہ گہرا نظر آتا ہے۔ انھوں نے خود کو اپنی خودنوشت میں ایک پیر طریقت کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس لیے ان کی زندگی کے دوسرے پہلو قاری کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہیں خواجہ صاحب نے اس کا اعتراف خود کیا ہے کہ بعض دوستوں اور مخلصوں نے ان کی زندگی کے دوسرے حالات کو ان کی سوانح سے حذف کروا دیا۔ انھوں نے اس کتاب میں محض ان باتوں کو پیش کیا ہے جن سے مریدوں کی اصلاح ہوتی ہے اور انھیں ترغیب دین اور اعلیٰ ہمتی کا سبق ملتا ہے۔ خواجہ صاحب اپنی آپ بیتی کی شان نزول کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "یا اللہ میری مدد کر میں یہ کتاب تیرے ان بندوں کے لیے لکھتا ہوں جنھوں نے تیری محبت اور تیری طلب اور تیرے دین اسلام کی حقانیت و روحانیت حاصل کرنے کو میرے ہاتھ پر بیعت کی اور اس واسطے میں نے اس کتاب کا نام پیر بھائی رکھا ہے کہ تو ہم سب کا پیر ہے اور ہم آپس میں (تیرے مرید ہونے کے سبب) پیر بھائی ہیں۔"[۲۲]

مندرجہ بالا اقتباس اس بات کا غماز ہے کہ مصنف نے اپنی آپ بیتی ایک خاص مقصد کے تحت لکھی ہے اور وہ مقصد متعین ہے یعنی مریدوں کی اصلاح اور ان کو راہ حق کی تلقین کرنا

---

[۲۲] آپ بیتی، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۲۲ء، بار دوم، ص ۱۳

Marfat.com

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس کتاب کا نام ابتدا میں پرچھائی رکھا تھا لیکن شائع کرتے وقت اس کا نام بدل کر آپ بیتی رکھ دیا۔ میرے خیال میں خود نوشت کے لیے لفظ آپ بیتی ادبی حیثیت سے سب سے پہلے خواجہ صاحب نے اپنی خود نوشت سوانح حیات کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس سے پہلے اس صنف کے لیے فارسی اور اردو میں تذکرہ، احوال وغیرہ الفاظ مستعمل تھے۔ یا پھر خود نوشت لکھنے والوں نے موضوع اور مواد کے لحاظ سے اپنی خود نوشت کا نام "کالا پانی"، "حالات غدر" وغیرہ رکھا تھا۔ اردو شاعری میں آپ بیتی کا لفظ عہدِ قدیم سے رائج ہے۔ انشاء کا شعر ہے ؎

جان صدقے اس پری کے جس نے انشاؔ سے کہا
آپ بیتی کہہ کہانی کچھ کسی کی مت چلا

اس لحاظ سے خواجہ حسن نظامی کو اس باب میں اوّلیت کا شرف حاصل ہے کہ انھوں نے خود نوشت کی نثری ہیئت کو آپ بیتی کا لفظ بخشا۔ خواجہ حسن نظامی کی خود نوشت کا موضوع پند و نصائح اور خود احتسابی ہے۔ جس میں مصنف کا مقصد تبلیغ دین، تصوف کے اسرار و رموز کی وضاحت اور تزکیۂ نفس نیز روحانیت ہے لیکن مصنف نے اپنی زندگی کے وہ پہلو حذف کر دیے، جو اس مقصد کے دائرے سے باہر تھے اور جن کی روشنی میں یہ خود نوشت ان کی شخصیت کا زیادہ بہتر عکس قرار پاتی۔ خواجہ صاحب کی آپ بیتی موجودہ شکل میں صرف مریدوں کے لیے چراغِ ہدایت ہے خواجہ صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ذات کو وسیلہ بنا کر مریدوں کو تصوف اور دین کی تعلیم سے روشناس کیا۔ یہ مقصد انھوں نے مختلف انداز سے حاصل کیا۔ اپنے بچپن اور لڑکپن کے واقعات اور احساسات سے مریدوں کے بچوں کی تربیت پر زور دیا۔ علاوہ ازیں اپنی محنت اور جانفشانی سے مقامِ اعلیٰ تک رسائی کے واقعات نقل کر کے نہ صرف مریدوں بلکہ تمام بنی نوعِ انسان کو محنت اور دیانت داری کا سبق دیا ہے ـــــ خواجہ صاحب نے اپنی خود نوشت کو براہِ راست پیش کیا ہے لیکن اس کا اثر بالواسطہ مریدوں پر پڑتا ہے۔ انھوں نے اپنی پیدائش سے لے کر ۱۴ سال کی عمر تک واقعات اس طرح منتخب کر کے پیش کیے ہیں کہ ان کا مقصد بھی پورا ہو جائے اور ان کی زندگی کی مخصوص تصویر کشی بھی ہو جائے۔ خواجہ صاحب نے اپنی حیات کے ابتدائی برسوں کو خود نوشت کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ اہم برس ان کے

Marfat.com

بچپن اور جوانی پر مشتمل ہیں ۔ ان ایام میں خواجہ صاحب کی زندگی میں سیکڑوں واقعات اور حالات گزرے ہوں گے لیکن انھوں نے کمال دانائی کے ساتھ صرف وہ واقعات اور تفصیلات پیش کی ہیں، جن سے ان کی زندگی کی صرف یک رخی تصویر ہی سامنے آتی ہے ۔ چنانچہ اپنی زندگی کی چالیس سالہ داستان کا آغاز اس انداز سے کرتے ہیں :

"تیرہویں صدی کے خاتمہ کے قریب ۱۲۹۶ھ کے ۲ محرم کی جمعرات کے دن صبح صادق کے وقت حسن نظامی پیدا ہوا۔ جس کی رو سے آج کل کہ جمادی الاول ۱۳۳۷ھ میں اس کی عمر ۴۱ سال ہے ۔"[۲۳]

مندرجہ بالا اقتباس سے خواجہ صاحب کی ولادت کا دن تاریخ اور سنہ معلوم ہو جاتا ہے لیکن خواجہ صاحب نے اس بات پر روشنی نہیں ڈالی کہ انھیں یہ معلومات کس ذریعہ سے حاصل ہوئیں ۔ ان کے والد پڑھے لکھے انسان نہیں تھے اور ان کا سنہ پیدائش وغیرہ ان کی یادداشت (جو ذاتی تجربے پر منحصر ہوتی ہے) کا حصہ نہیں ہے ۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ اپنے ماخذ کا حوالہ بھی تحریر کر دیتے ۔ خواجہ صاحب نے خود نوشت میں اس طرف بھی توجہ مبذول کرائی ہے کہ انھوں نے اردو میں فنی طور پر خود نوشت سوانح نگاری کا آغاز کیا ہے ۔ اگر اس بات سے اتفاق بھی کیا جائے تو انھیں آپ بیتی کے فنی تقاضے پورے کرنے چاہئیں تھے ۔ تاہم نقشِ اوّل ہونے کی وجہ سے اس خود نوشت میں جو خامیاں نظر آتی ہیں ان سے صرفِ نظر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ خواجہ صاحب نے اپنے بچپن کے واقعات کو تفصیل سے بیان کیا ہے جس سے قاری کو ان کی نفسیات کو سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے ۔ ان کی تحریروں سے اس عہد کا ماحول اور بستی حضرت نظام الدینؒ کے باشندوں کی معاشی اور ثقافتی زندگی کا معیار ہمارے سامنے آجاتا ہے ۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خواجہ صاحب نے بالواسطہ اپنے اردگرد کے ماحول کو اپنی ذات کے وسیلے سے پیش کیا ہے ۔ دوسرے خود نوشت نگاروں کی طرح ، اپنے عہد کی تاریخ یا اشخاص کا تعارف الگ عنوان یا ذیلی سرخیوں کے تحت نہیں کرایا ہے ۔ خود نوشت کے مطالعے کے بعد قاری کو ان کی نفسیات سمجھنے میں خارجی عوامل کا سہارا نہیں لینا پڑتا ہے ۔ بچپن اور لڑکپن کے بعض

---

[۲۳] آپ بیتی ص ۲۳

Marfat.com

کھیل اور واقعات میں مستقبل کے خواجہ حسن نظامی کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔

بچپن میں خواجہ صاحب محلے کے لڑکوں کے ساتھ سرکنڈے اور گولیاں کھیلا کرتے تھے۔ ان کے گھر میں یہ پابندیاں نہیں تھیں کہ فلاں لڑکوں کے ساتھ نہ کھیلنا یا فلاں کھیل شرفا کے بچوں کو نہ کھیلنا چاہیئے جیسا کہ اس عہد کے شرفا کا عام مزاج تھا۔ انھوں نے پانچ برس کی عمر میں اسکول میں داخلہ لیا تو وہاں لڑکوں کا ایک گروپ بنایا اور ان کے لیڈر بن گئے پھر ذرا اور بڑے ہوئے تو کھیل کھیل میں اپنے آپ کو بادشاہ منوانے کے لیے دوسرے لڑکوں پر زور دیتے اور ایک بلند مقام پر بیٹھ کر دوسروں پر رعب جماتے۔ اس حرکت پر ایک بار اپنے چچازاد بھائی سے پٹے لیکن بادشاہ بننے کا نشہ نہ اترا۔ ان واقعات کے پیچھے خواجہ صاحب کی جو نفسیات کارفرما ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں۔ بڑا بننے کا یہی شوق ان کی زندگی کے تمام کاموں کا محرک ہے۔ خواہ کام تصوف سے متعلق ہوں یا سیاست یا ادبیت سے۔ ان کی والدہ نے بچپن میں خدا اور رسول کی عظمت اور مذہبی امور کی حرمت ان کے ذہن نشین کرادی تھی جو تصوف کی طرف مراجعت کا سبب بنی خواجہ صاحب نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ انھوں نے اپنے تمام نیک و بد حالات اس کتاب میں تحریر کر دیے ہیں۔ انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے:

"ایک عرصہ ہوا میں نے آپ بیتی حسن نظامی کے نام سے لکھنا شروع کی تھی مگر پھر اس کو ترک کر دیا کیوں کہ اس میں مجھ کو خود نمائی کی بو آئی۔ اب خیال آیا کہ پرچھائیوں کے تجربہ کے لیے اپنے سب نیک و بد حالات مرتب کر دینے مناسب ہیں کہ اس میں ان کو میری زندگی کے تاریک حالات بھی معلوم ہو جائیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی کسی مخفی بات کو پردہ میں نہ رکھوں اور اپنے ان کاموں کو بھی لکھ دوں جو لوگوں کی نظر میں اچھے ہیں اور ان کو بھی بیان کر دوں جو عیب و گناہ اور خلاف آدمیت ہیں۔"[۲۴]

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں جو حقائق سامنے آتے ہیں اس سے یہ نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے اس آپ بیتی سے پہلے بھی اپنی ایک اور آپ بیتی لکھی تھی۔ لیکن اسے منظر عام

---

[۲۴] آپ بیتی، ص ۱۶

Marfat.com

پر نہیں لائے۔ دوسرا بہت اہم انکشاف یہ ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب شعوری طور پر خودنوشت میں سچائی کے عنصر کی اہمیت سے واقف تھے جس پر انھوں نے خاصا زور دیا ہے۔ اگر خواجہ صاحب انگریزی زبان اور ادب سے واقف ہوتے تو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ انھوں نے انگریزی کے ادیبوں کے خیالات سے فائدہ اٹھایا مگر ایسا نہیں ہے۔ اس لیے اردو خودنوشت سوانح نگاروں میں خواجہ صاحب کو اس اوّلیت کا شرف حاصل ہے کہ وہ خودنوشت کو انسان کی زندگی کی سچی تصویر سمجھتے تھے۔ خودنوشت کی بنیاد مصنف کے نیک و بدحالات پر ہی ہوتی ہے۔ متذکرہ بالا بیان کی روشنی میں خودنوشت کا مطالعہ آسان ہو جاتا ہے خواجہ صاحب کی آپ بیتی پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی خودنوشت کے بارے میں یہ رائے اس وقت تحریر کی تھی جب وہ سارے اجزا شامل تھے جنھیں بعد کو مریدوں اور دوستوں کے اصرار پر حذف کر دیا گیا۔ آپ بیتی کے بغور مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انکی مطبوعہ آپ بیتی میں خودنمائی کی جگہ انکسار نے لے لی ہے اور اسمیں صرف نیک حالات پر اکتفا کیا گیا ہے بدی کا حصہ سرے سے مفقود ہے گناہ کے ضمن میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں انھیں دھوکہ اور بد دیانتی کہا جا سکتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی خودنوشت میں یہ التزام کیا ہے کہ واقعات کے اظہار میں مبالغے یا شاعرانہ غلو سے کام نہ لیا جائے۔

اپنے خاندان کے بارے میں انھوں نے تحریر کیا ہے کہ وہ حضرت محمد امام نواسہ بابا فرید کی اولاد سے ہیں۔ اس مقام پر تاریخی شواہد کی روشنی میں محمد امام کو حضرت محبوب الٰہی کا سجادہ نشین ثابت کیا ہے۔

لکھتے ہیں:-

"حضرت محبوب الٰہی کے کوئی اولاد نہ تھی۔ آپ نے ساری عمر نکاح ہی نہیں کیا تھا اور سید امام ہی ان کے فرزند معنوی اور حقیقی کے طور پر مانے جاتے تھے اور وہی لفظاً، معناً اور مجازاً و حقیقتاً اور علمی اعتبار سے محبوب الٰہی کے جانشین تھے...
...... ان مستند اور معتبر حالات کی بنا پر درگاہ حضرت محبوب الٰہی کی سجادگی کا حق اولاد خواجہ سید محمد امام کا ہے اور قیامت تک رہے گا۔"[ف۲۵]

ف۲۵ آپ بیتی، ص۲۳

Marfat.com

اس طویل شجرے کے ماسوا خواجہ صاحب نے اپنے بارے میں چند مزید معلومات درج کی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ میری قومیت سید ہے۔ والد نے نام قاسم علی رکھا۔ اور ماموں سید بہادر علی شاہ، حسین علی کہتے تھے لیکن خواجہ صاحب نے اپنا قلمی نام حسن نظامی اختیار کیا۔ ان معلومات کے علاوہ خواجہ صاحب نے اپنا پورا حلیہ تحریر کیا ہے۔ جس سے یہ فائدہ ہے کہ جن لوگوں نے انھیں نہیں دیکھا ان کے سامنے خواجہ صاحب کا نقشہ آجاتا ہے۔ اردو خود نوشت میں کسی دوسرے مصنف نے اس طرح اپنا حلیہ تحریر نہیں کیا ہے۔ ہاں مرزا غالب[۲۶] نے حاتم علی مہر کو ایک خط کے جواب میں اپنا حلیہ یا قلمی چہرہ ضرور تحریر کیا ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی آپ بیتی میں جن حالات و واقعات کو تحریر کیا ہے۔ انھیں خواجہ صاحب کی زندگی کا نصب العین یا مقصود حیات کہا جاسکتا ہے اس مقصود حیات کو پورا کرنے اور اس پر عمل کرنے کے سلسلہ میں جو باتیں رونما ہوئیں، خواجہ صاحب نے انھیں باتوں کو اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنے مقصود کو پیش نظر رکھ کر جو لائحۂ عمل متعین کیا تھا وہ اس طرح ہے:

"اسلامی تصوّف کو نئے انداز اور جدید طرز میں لکھا اور برتا جائے۔

چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر اس نے (حلقۂ نظام مشائخ) نے اپنا عمل شروع کیا۔ حلقۂ نظام مشائخ کی اغراض اربع بھی اسی اصول پر قائم کی گئی تھیں جن میں ایک تصوف کی حفاظت و اشاعت دوسری مشائخ صوفیاء کو مرکز اتحاد پر لانا۔ تیسری عرسوں اور خانقاہوں کی ان مراسم کی اصلاح تھی جو دائرۂ شریعت و طریقت سے خارج ہو گئی ہیں۔ چوتھی مشائخ کے سیاسی حقوق کی حفاظت"[۲۷]

مندرجہ بالا مقاصد کو سامنے رکھ کر خواجہ صاحب نے جب اپنی کوششیں جاری کیں تو اہلِ خاندان اور دوسرے اشخاص نے خواجہ صاحب سے اختلاف کیا۔ جس کا ذکر خود نوشت کے اوراق میں ہے۔ لیکن یہ اپنی کوشش میں لگے رہے۔ صوفیاء کی خانقاہوں اور عرسوں میں طوائفوں

---

۲۶ ؎ عود ہندی، مطبع تیج کمار، لکھنؤ، گیارہویں بار ۱۹۶۸ء، ص ۱۶۳

۲۷ ؎ آپ بیتی ص ۳۱-۳۲

Marfat.com

کے ناچنے اور گانے کی جو بدعت شروع ہو گئی تھی، خواجہ صاحب نے اس کے خلاف لکھنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں خواجہ صاحب نے نظام دکن میر عثمان علی خاں سے ایک فرمان جاری کرایا تھا جس کی رو سے حیدر آباد کی سلطنت میں ہر ایک مزار پر طوائفوں کا ناچنا اور گانا ممنوع قرار دیا گیا تھا اس سلسلہ میں خواجہ صاحب کا یہ اہم کارنامہ تھا اور اپنے مقصد کی طرف کامیابی کا ایک قدم تھا۔ انھوں نے تصوف کی اشاعت اور فروغ کے لیے رسالہ المشائخ کا اجرا کیا اور کتابیں لکھیں جن کے ذریعہ لوگوں کو اصل تصوف کی طرف راغب کیا گیا۔ لیکن خواجہ صاحب نے تصوف کے نام پر بعض اختلافی مسائل کو پیش کیا۔ مثلاً لا الٰہ الا اللہ کہنے والے کو جنت ملے گی۔ یعنی رسالت کا اقرار ضروری نہیں۔ میت کو دفنانے کی جگہ شیشے کے شوکیس میں رکھنے کا مشورہ دیا وغیرہ۔ ایسی باتیں ان کی تحریروں میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ مشائخ کے سیاسی حقوق کی حفاظت کا مسئلہ بھی خالص سیاسی نوعیت کا ہے۔ چونکہ چشتیہ سلسلہ کے پیروں نے کبھی سیاست میں فعال حصہ نہیں لیا ہاں خیر کے لیے دعائیں کی ہیں اور بروقت ضرورت حاکمانِ وقت کو تنبیہ بھی کی ہے۔ اس لیے اس مسئلہ میں خواجہ صاحب نے ولی اللٰہی تحریک اور حضرت مجدد الف ثانی کے کارناموں کو بنیاد بنا کر سیاسی میدان میں آنے کی دعوت دی۔

خواجہ صاحب نے اپنی آپ بیتی میں بیعت اور پیروں کا ذکر بھی کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ گیارہ برس کی عمر میں اپنے والد کے ایماں پر تونسہ شریف میں شاہ اللہ بخش کے ہاتھ پر بیعت ہوئے۔ خواجہ صاحب کے والد اور دیگر اہلِ خاندان بھی تونسہ شریف کے عقیدت مند تھے۔ خواجہ صاحب بھائی کے مشورہ پر دوبارہ خواجہ غلام فرید کے مرید ہوئے انھوں نے اپنی بزرگی اور ولایت کے اظہار کے طور پر ایک باطنی اشارہ کا ذکر کیا ہے جس کے ماتحت ۲۳ سال کی عمر میں حضرت بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کے باطنی اشارہ پر منٹ گمری میں مولانا پیر سید مہر علی شاہ سے مرید ہوئے۔ خواجہ صاحب نے بیان کیا ہے کہ ان کی بیعت کے بعد دینی ترقی شروع ہوئی۔ ہر چند کہ خواجہ صاحب اپنے پہلے دونوں پیروں کو مکمل اور صاحب کشف وحال مانتے ہیں لیکن انھوں نے اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ ایک زندہ ہادی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چشتیہ سلسلہ کے پیروں نے ایک سے زیادہ مشائخ کے ہاتھ پر

Marfat.com

بیعت کی ہے ۔میری معلومات کی حد تک یہ بات صحیح نہیں ہے ۔حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ نے خلافت اور فیوض تو متعدد بزرگوں سے حاصل کئے لیکن مرید ایک ہی کے تھے ۔اس طرح حضرت قطب الدین بختیار کاکی حضرت شیخ العالم فریدؒ گنج شکر حضرت محبوب الٰہیؒ سارے پیران سلف صرف ایک پیر کے دامن گرفتہ تھے ۔خواجہ صاحب نے اپنی آپ بیتی میں تصوف کے اسرار و رموز بیان نہیں کئے ہیں ۔ اگرچہ ان جیسے تصوف اور خانقاہی مزاج کے شخص سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ واردات قلبی کو ضابطہ تحریر میں لاتے ۔کہیں کہیں ضمناً تصوف کی کچھ اصطلاحات پر روشنی ڈالی ہے مثلاً مکاشفہ کے بارے میں تحریر کرتے ہیں :۔

"حس کے خیالات پراگندہ نہ ہوں اور اشغال سے اس نے اپنی قوت خیالی کو جمع کرلیا ہو تو اس کو دوسرے کے اور اپنے حالات کا کشف ہوسکتا ہے ..
. . . . لیکن یہ ہر وقت نہیں ہوتا نہ یہ اپنے اختیار کی چیز ہے جس خیال کے اجتماع پر اس کا انحصار ہے وہ ذاتی اختیار کی شے نہیں ہے"[۲۸]

خواجہ صاحب نے مکاشفہ کو بڑے سادہ اور عام فہم انداز میں بیان کیا ہے لیکن مکاشفہ ایسی چیز نہیں کہ وہ اتنی سادگی اور عام فہم انداز کے باوجود ہر ایک کی سمجھ میں آجائے ۔خواجہ صاحب نے تحریر کیا ہے کہ یہ اپنے اختیار کی شے نہیں ہے کیونکہ ایک مخصوص خیال کے اجتماع پر اس کا انحصار ہے اور خواجہ صاحب نے اس مخصوص خیال کی وضاحت نہیں کی ہے کہ کشف ایک وقتی کیفیت کا نام ہے جو کبھی وارد ہوتی ہے اور کبھی نہیں ۔گویا کشف بھی منجملہ وحی ہے جو نازل ہوتی ہے ۔یہ امر محال ہے ۔ صاحبِ کشف بزرگ جب چاہتا ہے تو اس کے سامنے ہر چیز عیاں ہوجاتی ہے جیسا کہ بزرگوں کی سوانح میں ملتا ہے ۔خواجہ صاحب نے خود اپنی کتاب نظامی بنسری میں بزرگوں کے ذکر میں ایسے واقعات درج کئے ہیں جن سے میرے خیال کی تصدیق ہوتی ہے ۔خواجہ صاحب نے جس کیفیت کو کشف کہا ہے وہ کیفیت مختلف ہے جیسے اس شعر میں پیش کیا گیا ہے

گہ بر طارم اعلیٰ نشینم
گہ بر پشت و پائے خود نبینم

۲۸ؔ آپ بیتی صہ ۱۳۷

Marfat.com

لیکن کشف ایک عطیہ خداوندی ہے۔ ایک بار جب بندۂ خدا کو کشف کی قوت عطا ہو گئی تو وہ جب چاہے اس سے کام لے سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ جمعہ کا خطبہ دیتے ہوئے آپ نے فرمایا: یاسارتیہ الجبل اس نکتہ سے ہر صوفی آگاہ ہے کہ صوفی کے قلب پر جو روحانی انکشافات ہوتے ہیں، عرف عام میں انھیں مکاشفات کا نام دیا جاتا ہے۔

خودنوشت سوانح میں مصنف کی نفسیات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی نفسیات کو واقعات کے ذریعہ قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ انھیں گداگروں سے نفرت ہے اور اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں ان کے گلے سے ایک فقیر نے نادعلی کا پتر نکال لیا تھا جس سے انھیں گداگروں سے نفرت ہو گئی تھی اور وہ نفرت ان کے لاشعور کا حصہ بن گئی تھی۔ چونکہ گداگری کا برعکس تونگری اور شاہی ہے۔ اس لیے خواجہ صاحب کے دل میں تونگر بننے کی شدید خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ انھوں نے بچپن میں پیسے پر ملکہ وکٹوریہ کی تصویر دیکھی۔ والدہ سے اصرار کیا کہ ان کی تصویر پیسے پر کھدوا دی جائے۔ والدہ نے ملکہ کے ملک و مال کا ذکر کیا۔ اس سے ان کے معصوم دل میں بادشاہ بننے اور سکہ پر تصویر بنوانے کی شدید خواہش پیدا ہو گئی۔ اس خواہش نے ان سے اتنی محنت اور جفاکشی کروائی کہ وہ علی حسن سے خواجہ حسن نظامی ہو گئے۔ خواجہ صاحب کے سامنے خودنوشت سوانح حیات کا کوئی نمونہ نہیں تھا اور وہ خود کو اردو زبان میں باضابطہ آپ بیتی کا موجد قرار دیتے ہیں[۲۹] لیکن ان کی خودنوشت میں نفسیاتی اشارے اور حالات کو اعجاز و اختصار سے بیان کرنے کا پورا فن جلوہ گر ہے۔ ان کی معاشی، مذہبی اور ادبی زندگی کی پوری تصویر ان کی خودنوشت کے ذریعہ سامنے آتی ہے۔ ان کی پہلی تصنیف ۱۹۰۰ء میں مفلسی کے مجرب علاج کے نام سے شائع ہوئی۔ پہلا مربد جنرل ڈکسن ہوا۔ پہلا مضمون انڈیا گزٹ بمبئی میں انڈیا کی نازک صورتِ حال عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون کے شائع ہونے پر ان کے بڑے بھائی بہت خفا ہوئے۔ انھیں خدشہ تھا کہ انگریزی حکام دار و گیر کی کوشش شروع کر دیں گے اس واقعہ سے ایک طرف خواجہ صاحب کی بے باکی اور حق گوئی پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری سمت

---

۲۹ آپ بیتی ص۴

Marfat.com

اس دور کے عوام پر انگریزوں کی دہشت اور رعب بے جا کا پتہ چلتا ہے۔ خواجہ صاحب نے تحریر کیا ہے کہ ان کی دوسری تصنیف ۱۹۱۱ء میں ظہور مہدی یعنی شیخ سنوسی کے نام سے منظر عام پر آئی جس کی ہر دلعزیزی اور فوری فروخت سے ان کی مالی حالت درست ہوئی اور دوسری کتابیں لکھنے کی طرف رغبت ہوئی۔ اس طرح ۱۹۱۹ء تک خواجہ صاحب نے اپنی مختلف تصانیف کی فہرست دی جس کی رو سے ان کی کتابوں کی تعداد اس وقت تک ۴۶ قرار پائی ہے۔ انھوں نے اپنی فطرت اور مزاج کے متعلق بھی اظہار خیال کیا ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنی طبیعت کی مندرجہ ذیل خصوصیات کی کارفرمائی کا ذکر کیا ہے:

(۱) ضد اور ہٹ (۲) سنگدلی (۳) قناعت

(۴) ہمدردی (۵) غریبوں سے محبت

ان خصوصیات میں یعنی ضد اور سنگدلی منفی اور سخت مضر خصوصیات ہیں۔ البتہ دو قناعت اور ہمدردی مثبت اور مفید ہیں۔ خواجہ صاحب نے اپنی آپ بیتی میں بعض مصلحین کا ذکر کیا ہے۔ ملا واحدی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ خواجہ صاحب اکبر الہ آبادی کا ایسا احترام کرتے تھے جیسا کہ ایک مرید پیر کا کرتا ہے۔ اکبر الہ آبادی کے علاوہ نواب غلام نصیر الدین خاں، مولانا محمد یحییٰ صاحب، چھٹے مصلح کا نام خواجہ صاحب نے یتیمی، بے کسی اور مفلسی قرار دیا ہے اور آخری مصلح ذات خداوند کو مانتے ہیں۔ انھوں نے اپنی روحانی قوتوں کے علاوہ سفلی عمل مسمریزم سے بھی کام لیا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کی شخصیت ان کی زندگی ہی میں متنازعہ ہو چکی تھی۔ ان کے دینی عقائد ہوں خواہ ان کی حب الوطنی، دونوں کے سلسلے میں متضاد رائیں ملتی ہیں، جھٹکے کے گوشت کا مسئلہ ہو یا نئی قسم کی قبر کی تجویز ہو اور اسی قسم کی دوسری رایوں کی بدولت علمائے وقت اور دیگر لوگوں نے ان پر تکفیر کے فتوے لگائے اور ان کی ذاتیات پر بھی حملے کیے لیکن یہ سب کچھ ان کی خودنوشت یعنی ۱۹۱۹ء کے بعد کی باتیں ہیں جن کا ذکر کرنا نہ ہی ضروری ہے اور نہ اس غلط بحث کا کوئی جواز ہے۔ یہ مسائل مفتیان شرع متین اور ناقدین ملک و ملت جانیں۔ مجھے صرف ان کی خودنوشت کے اندراجات اور اسلوب سے بحث کرنی ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنی خودنوشت چونکہ مریدوں کی تعلیم کے لیے تحریر کی ہے اس لیے اس

Marfat.com

کا اسلوب انتہائی سادہ اور ناصحانہ ہے۔ واقعات اور احساسات کو خالص بیانیہ انداز میں تحریر کرتے چلے گئے ہیں اور جہاں کہیں انھیں کوئی گُر کی بات ملی، فوراً اس کو مریدوں تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ ان کی والدہ نے جب انھیں نادعلی پہنایا اور نادعلی کی عظمت بیان کی تو ان کے دل میں خدا رسولؐ کا احترام پیدا ہوا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد مریدوں سے مخاطب ہوتے ہیں:

"اس واقعہ سے پیر بھائی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اگر ان کی عورتیں چھوٹے بچوں کے سامنے دین اور ایمان اور دنیاوی حوصلہ مندیوں کی اچھی اچھی باتیں کیا کریں تو بچے ان کو کبھی نہ بھولیں اور شروع ہی سے ان کی ایک پختہ ایمانی خصلت تیار ہوجائے گی"۔ ؎۳۰

ایک جگہ اپنے لڑکپن میں تھیٹر دیکھنے کا ذکر کیا ہے اور اس میں استغراق کا نقشہ کھینچا ہے کہ کس طرح ان کو رات کو بھی وہی آوازیں سنائی دیتی تھیں لیکن بظاہر مقصد صرف یہ تھا کہ مریدوں کو نصیحت کی جائے۔ کہ اپنے کم عمر بچوں کو تھیٹر قطعی نہ دیکھنے دیں۔

خواجہ صاحب اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہیں لیکن آپ بیتی کے فن کو اس سے نقصان پہنچا ہے۔ کیونکہ مصنف کی ذات مقاصد کے حصار میں محصور ہو کر رہ جاتی ہے۔ فن کا تقاضا یہ ہے کہ اگر خود نوشت کسی مقصد کے تابع بھی ہو تو وہ مقصد بین السطور میں ہونا چاہیئے اور خود نوشت نگار کی ذات پوری طرح قاری کے سامنے ہونی چاہیے۔ جہاں تک ان کے اسلوب کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تحریر میں بڑے بڑے جملے تشبیہوں اور استعاروں سے اجتناب نظر آتا ہے۔ انہوں نے دلی کی زبان اور محاوروں کو اپنی عبارت کی آرائش کے لیے بے کار استعمال نہیں کیا ہے ورنہ میر امن کی طرح وہ بھی اس دعوی کے حق دار ہیں کہ 'دلی کے روڑے ہیں'، خواجہ صاحب نے اپنی آپ بیتی میں دوسری تصانیف سے بڑھ کر سادگی اور عام پسندی کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ وہ اپنی خود نوشت کے اسلوب کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

؎۳۰ آپ بیتی، ص۳۹

Marfat.com

"میرا خیال ہے شروع زمانہ میں صاف اور بے عیب عبارتیں بہت لکھ دیں اب زمانہ عبارت آرائی کا نہیں ہے بلکہ مفید اور ضروری مضامین اردو زبان میں جمع کرنے کا وقت ہے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ قلم برداشتہ لکھتا چلا جاؤں قواعد اور چستی عبارت کی پرواہ نہ کروں" [۳۱]

خواجہ صاحب نے اپنی آپ بیتی میں عبارت آرائی نہیں کی ہے لیکن قواعد کی غلطی یا عبارت کی چستی میں کہیں کوئی حرف نہیں آتا۔ انھوں نے نامانوس اور ثقیل الفاظ استعمال نہیں کئے اور نہ ہی الفاظ کے طلسم میں قاری کو گرفتار کیا ہے جو خود محسوس کیا ہے۔ اس کو من وعن الفاظ کا جامہ پہنا کر اپنے قاری تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ بیشتر مذہبی اشخاص نے جب اپنی آپ بیتی لکھی ہے تو اسے عربی کے نامانوس الفاظ اور احادیث و آیات سے پرمغز بنایا ہے لیکن خواجہ صاحب نے مذہبی مقصد کو سامنے رکھ کر اپنے حالات قلم بند کرنے کے باوجود اپنی آپ بیتی کو عربی و فارسی لفظیات سے بوجھل نہیں ہونے دیا۔

ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی نے آپ بیتی پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس کے اسلوب کو ان کی تحریر کی کم مائیگی پر محمول کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"خواجہ صاحب کی سوانح عمری ہوں یا خاکے ان میں سوائے سطحیت کے کچھ نہیں ہے۔ ان میں سعی و کاوش اور غور و فکر کا عنصر ناپید ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب لائٹ لٹریچر لکھنے کے عادی تھے۔ انھوں نے اردو کو لائٹ لٹریچر ضرور دیا ہے مگر اس میں گہرائی و گیرائی نہیں ہے۔" [۳۲]

امام مرتضیٰ نقوی شاید سلیس انداز اور از دل خیزد بر دل ریزد کے اسلوب کو سطحی اسلوب تصور کرتے ہیں اور عربی و فارسی لفظیات کے استعمال کو غور و فکر کا عنصر سمجھتے ہیں۔ خود نوشت

---

۳۱ آپ بیتی ص ۹۲

۳۲ ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی: خواجہ حسن نظامی حیات اور ادبی خدمات، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ بار اول ۱۹۷۸ء ص ۳۰۳، ۳۰۴

Marfat.com

کی حد تک تو میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ اسلوب اور زبان تیز مقصد کی حد تک پوری طرح کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کی دوسری تحریروں میں جنھیں ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی نے لائٹ لٹریچر کہا ہے، مختلف اسالیب نظر آتے ہیں لیکن ان کی تحریروں کی سادگی کا اعتراف سبھی نے کیا ہے مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے خواجہ صاحب کی طرزِ تحریر پر اس انداز سے روشنی ڈالی ہے:

"کوئی سلیس، عام فہم، بے تکلف دہلی کا روزمرہ اور بول چال سننا چاہے تو حسن نظامی کی زبان سے سنے، کوئی میٹھی، سریلی، سجیلی، البیلی اردو کی بہار دیکھنا چاہے تو دہلی والے خواجہ کے قلم کے ترشے ہوئے گل بوٹے نقش و نگار دیکھ کر ان پر اپنا سر دھنے! بانکپن، شگفتگی اور ندرت بیان ان کا خاص ہنر ہے اور اثر و گداز! ان کے قلم کا بنیادی جوہر ہے۔"[۳۳]

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے ان کے اسلوب کی جن بنیادی خصوصیات کا ذکر کیا ہے وہ بھی امام مرتضیٰ نقوی کے خیال کی تردید کرتی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی نے آپ بیتی میں بیشتر مقامات پر بالکل عام فہم زبان استعمال کی ہے مثلاً:

"چند دن کی بات ہے سرکش دولت مند تباہ و برباد ہونے والے ہیں ان میں وہی سلامت رہیں گے جو اپنی محنت سے روپیہ کماتے ہیں یا محنت سے بزرگوں کا روپیہ بچاتے اور جائز کاموں میں صرف کرتے ہیں ...... باقی سب کا زوال آنے والا ہے۔"[۳۴]

خواجہ صاحب نے یہ اسلوب اور زبان صرف خود نوشت ہی میں استعمال کی ہے، ورنہ بحیثیت انشاپرداز انھوں نے جو دوسرے مضامین لکھے ہیں ان میں زبان کی چھلبل اور محاوروں کا چٹخارہ بھی ہے۔ کہیں کہیں مکالمہ کا انداز بھی ملتا ہے۔ انھوں نے تمثیل نگاری اور حکایتی اسلوب سے بھی کام لیا ہے۔ ایک سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب مقصدی نثر لکھتے وقت

---

[۳۳] منادی دہلی خواجہ حسن نظامی نمبر اگست ستمبر، ۱۹۵۶ء ص ۸۳

[۳۴] آپ بیتی ص ۸۵

Marfat.com

وہابی اسلوب سے کیوں متاثر ہوجاتے ہیں (وہابی اسلوب سے میری مراد صراط مستقیم سوانح احمدی وغیرہ کتب سے ہے) شاید دونوں کا مطمح نظر عوام تک اپنی بات پہنچانا تھا۔ اگرچہ خواجہ صاحب شعوری طور پر ان حضرات کے مقلد نہیں ہیں لیکن جب گفتگو مذہبی ہو اور عوام پسند بھی ہو، تو اسلوب سادہ و عام فہم ہونا ناگزیر ہے۔ عرفان نفس اور احتساب ذات مذہبی نظام فکر کا ایک اہم عنصر ہے۔ اسی جذبہ کے تحت خواجہ صاحب نے اپنی خودنوشت میں عرفان نفس کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا ہے۔ لکھتے ہیں:

> "میں نے جب کبھی اپنی زندگی کا روزنامچہ لکھا تو محسوس ہوا گویا اپنی ہستی کے عرفان کا بہی کھاتہ لکھ رہا ہوں۔ کیوں کہ جب اس کو دیکھتا ہوں آمد و خرچ کا حساب یاد آجاتا ہے پر یہ آپ بیتی کی نوشت بھی مجھ کو آگے چل کر (اگر زندہ رہا) زندگی کا حساب بتائے گی ناظرین کچھ بھی سمجھیں، میں نے یہ کتاب لکھ کر عرفان نفس کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے۔" [۳۵]

مندرجہ بالا سطور خودنوشت کے خاتمہ کی وہ چند سطور ہیں جن کے مطالعہ سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ خواجہ صاحب نے دوسرے مقاصد کے علاوہ اپنی خودنوشت عرفان نفس یا احتساب ذات کے طور بھی قلم بند کی تھی۔ اس کا مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے۔ مَن عَرَفَ نَفسَہٗ فقد عرف ربہٗ، حق شناسی ہو یا رشد و ہدایت، یہ بات خودنوشت سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایک مذہبی خودنوشت ہے جس کا مقصد بندگانِ خدا کو اسلام کے نظامِ عمل و فکر سے روشناس کرانا اور اکل حلال کی طرف رغبت دلانا ہے۔

خواجہ حسن نظامی کے اسلوب پر اردو کے اکثر نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے اور اس کی خوبیوں کو سراہا ہے۔ انھیں عبدالماجد دریا آبادی نے البیلا انشاء پرداز [۳۶]، مولانا رضا فرنگی محلی نے ایک

---

[۳۵] آپ بیتی ص ۱۴

[۳۶] منادی دہلی خواجہ نمبر اگست ستمبر ۱۹۵۶ء، ص ۸۳

[۳۷] " " " " " ص ۷۹

Marfat.com

ادیب[۳۷]۔ مولانا صلاح الدین نے ایک صاحبِ طرز انشا پرداز[۳۸] قرار دیا ہے اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے بھی ان کی انشا پردازی[۳۹] کو سراہا۔ ادھر ہر سال خواجہ حسن نظامی کے یوم وصال پر سیمینار ہوتا ہے جیمیں ملک کے ادیبوں اور نقادوں سے مقالے پڑھوائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دور میں اردو کے کئی اہم نقادوں نے ان کے اسلوب کے تجزیے پر خاصی محنت صرف کی ہے۔ سید حامد نے اپنے مقالے میں خواجہ حسن نظامی کی نثر کے عناصر ترکیبی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"خواجہ حسن نظامی کی نثر کے چند عناصر کا ذکر ہو چکا۔ یعنی دلی کی ٹکسالی زبان، روزمرہ چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے فقرے، قافیہ، تجنیس، وزن اور رعایت لفظی کا استعمال آٹے میں نمک کے برابر، جملوں کی با قرینہ تزئین کہ تزئین کا گمان بھی نہ ہو مگر تزئین کا جمال ہاتھ آجائے۔"[۴۰]

پروفیسر گوپی چند نارنگ نے اپنے مقالے بعنوان 'خواجہ صاحب کی نثری ارضیت' میں تحریر کیا ہے:

"وہ ایک منفرد اسلوب اور طرزِ خاص کے مالک تھے جس میں دہلوی زبان کا چٹخارہ اور روزمرے اور محاورے کا لطف، سادگی اور سلاست، بانکپن اور شگفتگی اور بے تکلفی و بے ساختگی کی جملہ خوبیاں تو تھیں ہی۔ لیکن ان کا کارنامہ یہ ہے کہ جہاں انھوں نے خشک مذہبی اور اصلاحی مباحث کو تصوف کے دائرے سے نکال کر ادب میں داخل کیا، وہاں اس کا رشتہ لوک ساہتیہ کی پراکرت روایت سے جوڑ دیا۔"[۴۱]

ان نقادوں کے علاوہ اور بہت سے نقادوں نے خواجہ صاحب کے اسلوب کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان رایوں کی روشنی میں ڈاکٹر امام مرتضیٰ نقوی کی اس بات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ جس میں انھوں نے خواجہ صاحب کے اسلوب میں محض سطحیت کی

---

[۳۸]، [۳۹]، [۴۰] ماہنامہ منادی دہلی خواجہ نمبر اگست ستمبر ۱۹۵۶ء، ص ۵۷، ۱۴

[۴۰] ماہنامہ منادی دہلی جلد ۴۵ شمارہ ۳، ۴ ص ۱۹ ۱۹۷۹ء

[۴۱] ماہنامہ منادی دہلی جلد ۵۲ ۱۹۷۷ء

Marfat.com

دریافت کی ہے۔

ہر چند کہ خود نوشت کا مصنف اس امر کا مجاز ہے کہ اپنے تصویر کے جتنے رخ چاہے دکھائے اور جو چاہے پوشیدہ رکھے لیکن اگر تصویر کا ہر رخ دکھایا جائے تو انتہائی دیانت داری اور سچائی کا مظہر ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کی خود نوشت کے پیش کردہ حصہ پر ہم غیر دیانت داری یا مبالغہ آرائی وغیرہ کا کوئی الزام عائد نہیں کر سکتے۔ انھوں نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کو سچائی سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ البتہ خود نوشت پر کسی حد تک اخفائے حال کا اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھوں نے اخفائے حال کا الزام بھی اپنے ذمہ نہیں لیا بلکہ احباب اور مریدین کے سر رکھا ہے۔ خواجہ صاحب سے پہلے اردو کے کسی ادیب یا شاعر نے اپنی سوانح عمری خود لکھ کر شائع نہیں کی تھی۔ اس بات کا اعتراف آپ بیتی کے دو دیباچہ نگاروں نے بھی کیا ہے۔ اس طرح خواجہ صاحب کی آپ بیتی اردو ادب میں پہلی شعوری کوشش ہے۔ خواجہ صاحب نے اسلوب اور زبان کی نہج پر خود نوشت کو عام فہم اور سادہ رکھا ہے۔ کہیں بھی اسلوب میں افسانوی انداز یا شعریت سے کام نہیں لیا اگرچہ خود نوشت میں محل و موقع کے لحاظ سے زبان و اسلوب کو افسانوی، شعری یا ڈرامائی عناصر سے مزین کیا جا سکتا ہے۔ خواجہ صاحب کی پوری خود نوشت میں ایک ہی اسلوب ہے اور یہ اسلوب ان کی دوسری تحریروں سے مختلف ہے۔ اس خود نوشت میں مذہبی روح تو کارفرما نظر آتی ہے لیکن خواجہ صاحب کی اجتہادی مذہبیت علما اور صوفیا کی متفقہ اور مشترکہ روش سے الگ ہے اور ان کی آپ بیتی پر مذہبی خود نوشتوں کی طرح الہامی انداز طاری نظر نہیں آتا۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ صاحب کی خود نوشت اپنے اسلوب اور زبان و بیان اپنی سادگی اور سلاست کی وجہ سے اردو میں منفرد و ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اگر یہ خود نوشت زندگی کے آخری ایام تک تحریر ہوتی تو بہت ہی مفید اور متنوع تجربوں کی حامل ہوتی۔

Marfat.com

نقشِ حیات

مولانا حسین احمد مدنی ہندوستانی علماء کے اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو مذہب اور سیاست کو الگ الگ تصور نہیں کرتا اور جس نے مذہب کے ساتھ سیاست کو بھی اپنی جولان گاہ بنایا ہے۔ مصنف نے اپنی خود نوشت میں ہندوستان کی سیاست اور مذہبی رواداری کو پوری طرح منعکس کیا ہے۔ انھوں نے آپ بیتی لکھنے کے مقصد اور محرک پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ شاید اس کے مطالعہ سے لوگوں کو فائدہ پہونچے۔ چنانچہ رقم طراز ہیں:

"بہر حال حسبِ ارشاد قرآنی واَمّا بِنِعمۃِ رَبّکَ فَحَدِّث ضروری معلوم ہوا کہ بطور تحدیثِ نعمتِ خداوند تعالیٰ کے اس فضل و کرم کے جو کہ مجھ پر اور میرے والدین اور خاندان پر سایہ گستر رہا ہے اور اب بھی سایہ فگن ہے تذکرہ کروں اور اس کے شکریہ کے گیت گا کر قلب اور دماغ ناظرین کو معطر کروں چونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ زمانہائے سالفہ میں اسلاف کرام نے اپنی سوانح عمریاں خود لکھی ہیں . . . .
اور اس زمانہ حال میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں میں اس کی بکثرت مثالیں پائی جاتی ہیں اور چونکہ اپنی بیتی اور سرگزشت سے السنان جس قدر واقف ہوتا ہے دوسرا نہیں ہوسکتا اس لیے کوئی وجہ معتمد علیہ اس سے باز رہنے اور اس کے تذکرہ کو ترک کرنے کی معلوم نہیں ہوتی۔ خصوصًا اس بنا پر کہ امید ہے کہ شاید لوگوں کو صحیح حالات معلوم ہونے کی بنا پر کچھ نفع پہنچے یا کم از کم وہ ان بدظنیوں اور بدگوئیوں سے پرہیز کریں جو کہ دشمنان دین و مذہب نے اپنی خود غرضیوں کے ماتحت یورپین

Marfat.com

پروپیگنڈوں سے پھیلائی ہیں۔"[۴۲]

اس طویل اقتباس کو نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت سوانح حیات لکھنے کی غرض وغایت پر روشنی پڑ سکے۔ مصنف نے اپنی خود نوشت کا مقصد شکران نعمت اور اصل صورتِ حال سے عوام کو آگاہ کرنا بتایا ہے۔ مصنف نے انھیں مقاصد کو پیشِ نظر رکھ کر اس آپ بیتی کو ۱۹۴۴ء میں نینی جیل میں لکھنا شروع کیا۔ لیکن چند صفحات ہی مکمل ہوپائے تھے کہ ان کی رہائی ہوگئی اور باقی حالات جیل کی چہار دیواری سے باہر قلمبند ہوئے اور ۱۹۵۳ء کے آغاز میں خود نوشت تمام ہوئی۔ ڈاکٹر صبیحہ[۴۳] انور نے اس کی اشاعت ۱۹۵۲ء میں تحریر کی ہے جو صحیح نہیں ہے کیونکہ مصنف نے خود تحریر کیا ہے:

"اس تحریر کی ابتدا نینی جیل میں ۱۹۴۴ء میں ہوئی تھی۔ ابھی چند صفحات ہی لکھے تھے کہ رہائی ہوگئی۔ پھر جب بھی تکمیل کا ارادہ کیا مشاغل اور عوائق حائل ہوتے رہے۔ مگر احباب کے تقاضوں نے پیچھا نہیں چھوڑا۔ خدا خدا کرکے ۱۹۵۳ء کے آغاز میں یہ ٹوٹی پھوٹی تحریر اختتام کو پہنچی۔"[۴۴]

انور صابری کا جو قطعہ تاریخ جلد اوّل میں شامل ہے، اس سے بھی ۱۹۵۳ء ہی برآمد ہوتا ہے۔ انور صابری کا شعر حسب ذیل ہے:

پکارا یہ ہاتف ــ بجا خود نوشت

۱۳۷۲ھ

ہے اک شیخ کا نقشِ عزم حیات

۱۹۵۳ء

مندرجہ بالا شواہد کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ آپ بیتی ۱۹۵۳ء کے وسط میں شائع

۴۲؎ نقشِ حیات جلد اوّل، ناشر سید محمد اسعد، ۱۹۵۳ء طبع اول، ص ۲۰۳

۴۳؎ اردو میں خود نوشت سوانح حیات، ص ۲۳۳

۴۴؎ نقشِ حیات جلد دوم، ص ۲۷۲

Marfat.com

ہوئی ہے۔ یہ آپ بیتی دو جلدوں پر مشتمل ہے پہلی میں ۴۰۶ صفحات اور دوسری ۲۷۴ صفحات ہیں۔

مولانا نے اپنی خودنوشت کو تحدیث نعمت اور اپنے حالات کے تذکرہ تک محدود رکھنا چاہا تھا لیکن وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کی سیاسی بصیرت نے ان کے اشہب قلم کو سیاست کی طرف موڑ دیا اور مولانا قال اللہ اور قال الرسول سے نکل کر جہاد فی اللہ اور جہاد فی القوم میں منہمک ہو گئے۔ مولانا کی خودنوشت کے ایک چوتھائی اوراق تو مولانا کے شب و روز کی زندگی والدین اعزہ اور لواحقین کے حالات کے آئینہ دار ہیں۔ باقی اوراق پر ہندوستان میں انگریزوں کے ظلم واستبداد کی داستان کندہ ہے اور ہندوستان میں مسلمان شہنشاہوں کی بے تعصبی، وسعت نظری اور عالی حوصلگی کی وضاحت ملتی ہے۔

مولانا نے خودنوشت کا آغاز اپنی پیدائش کے سنہ سے کیا ہے جس کا ماخذ ان کے والد ماجد کی بیاض ہے۔ اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ مصنف ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں شوال کی انیسویں تاریخ کو شب کے گیارہ بجے پیدا ہوا۔ ان دنوں مولانا کے والد بانگرمئو (ضلع اناؤ) کے کسی مدرسہ میں صدر مدرس تھے۔ مولانا کے ابتدائی چند برس وہیں گزرے۔ پھر ان کے والد نے اپنے آبائی وطن ٹانڈہ میں اپنا تبادلہ کروالیا۔ اس کے بعد ان کا قیام بارہ برس کی عمر تک ٹانڈہ میں رہا۔ ابتدائی تعلیم بھی یہیں ہوئی۔ مولانا کو بچپن میں کھیل کود کا بہت شوق تھا لیکن والد کھیل کود کے مخالف تھے۔ ان کے والد نے چار برس کی عمر میں پڑھنے بٹھا دیا لیکن حسین احمد کھیل کے رسیا تھے۔ ان کو جب بھی موقع ملتا اپنے ماموں کے گھر بھاگ جاتے اور ان کے لڑکے جواد حسین کے ساتھ گوٹی کھیلتے۔ والد کو جب خبر ہوتی تو پکڑ لاتے اور پڑھنے بٹھا دیتے۔ چونکہ محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیلنا کودنا منع تھا۔ اس لیے گھر کی چہار دیواری میں صرف مطالعہ میں وقت گزرتا۔ گھر میں والدہ اور والد سے قرآن کا ناظرہ ختم کیا۔ انھوں نے آمد نامہ دستور الصبیان وغیرہ کتابیں گھر پر پڑھیں اور اسکول میں داخل ہو گئے۔ دن میں اسکول میں تعلیم حاصل کرتے تھے اور خالی اوقات میں گھر کی ایک بکری کو چرایا کرتے تھے۔ غرض حسین احمد کی ابتدائی زندگی جس طرح کی قیود میں گزری۔ اس زمانے کے تمام شریف گھرانوں کا یہی حال تھا۔ مولانا حسین احمد کے دو بھائی دیوبند کے دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے انھیں

Marfat.com

بھی تیرہ سال کی عمر میں دیوبند بھیج دیا گیا تھا، جہاں مولانا خلیل احمد نے انھیں گلستان اور میزان منشعب جیسی کتابیں پڑھائیں۔ انھوں نے دیوبند میں صفر ۱۳۰۹ھ سے شعبان ۱۳۱۶ء تک تقریباً سولہ سال قیام کیا۔ دوران تعلیم مولانا کو دیوبند کے اساتذہ سے انسیت پیدا ہو گئی اور خصوصاً حضرت مولانا محمود حسن سے گہرا قلبی لگاؤ ہو گیا۔ بعد میں یہی محبت عقیدت تک پہنچ گئی اور مولانا نے مولانا محمود حسن صاحب کے نقشِ قدم پر چلنا اپنے لیے باعثِ فخر اور سرمایہ افتخار تصور کیا۔ مولانا کی خود نوشت میں اب سے تقریباً ۹۰ سال پرانا دیوبند سانس لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی آپ بیتی سے علمائے کرام کے تبحر علمی، تعلیم سے ان کی رغبت اور شاگرد اور استاد کے رشتہ کی نوعیت کا ایک قابلِ قدر نمونہ سامنے آتا ہے۔ مولانا نے اپنے نسب کے سلسلہ میں اپنے مورثِ اعلیٰ کا نام شاہ نور الحق تحریر کیا ہے جو کسی زمانے میں الہداد پور قصبہ ٹانڈہ میں آئے اور یہاں تبلیغ دین کرنے لگے۔ منکرین نے ان سے جنگ کی۔ اور بقول مولانا حسین احمد مدنی نور الحق کی کرامت سے منکرین کا راجہ قلعہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ شاہ نور الحق صاحب مولانا کے جد اعلیٰ تھے۔ یعنی مولانا حسین احمد ان کی اولاد ذکور میں اٹھارویں پشت میں ہیں۔ مولانا حسین احمد مدنی نے شاہ نور الحق کا شجرہ نہیں دیا۔ محض انھیں خاندان کے بڑوں کی زبانی یہ پتہ چلا کہ شاہ نور الحق صاحب حضرت امام حسینؓ کی اولاد تھے۔ اس سلسلہ میں خود رقمطراز ہیں:

"آج ہمارے خاندان میں کوئی ایسا کاغذ موجود نہیں جس سے ظاہر ہو کہ موصوف کہاں سے آئے تھے اور سلسلۂ نسب فوقانی کیا تھا اور کس زمانہ میں آئے تھے مگر شجرۂ طریقت محفوظ ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ آپ شاہ داؤد چشتی کے اور وہ شاہ عتاب الدین چشتی کے اور وہ شاہ نجم الدین چشتی کے اور وہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ ہیں۔" [۴۵]

ظاہر ہے شجرۂ طریقت نسب نہیں ہو سکتا۔ مولانا کے قول کی تکذیب مقصود نہیں ہے

---

[۴۵] نقشِ حیات، جلد اوّل، ص ۵

Marfat.com

لیکن جیسے کہ انھوں نے اپنی ساری کتاب میں تاریخی کتب سے حوالہ درج کیے ہیں اگر اس سلسلہ میں کوئی بھی دستاویزی اور اہم ثبوت ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔ اس ضمن میں مولانا نے حضرت مولانا فضل الرحمنؒ کا قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے میرے والد کو سید زادہ کہا اور والد کے خواب نقل کئے ہیں جن سے ان کا سید زادہ ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اپنے خاندان کی عزیز داریوں کا ذکر کیا ہے، جو قرب وجوار کے شرفاء میں رہی ہیں۔ ان سب دلیلوں اور حوالوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نسب کے سلسلہ میں یا تو اپنی صفائی پیش کر رہے ہیں یا پھر کسی کمپلکس میں مبتلا ہیں۔ اگرچہ وہ نسلی تفاخر اور غرور کو نہایت قبیح مرض سمجھتے ہیں لیکن بہت خوبصورتی سے اپنی سیادت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خاندان کا ذریعہ معاش زمینداری کی آمدنی تھا جس کے ذریعہ پورا خاندان فارغ البالی سے گزر کرتا تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی نے لکھا ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء میں ان کے خاندان کے مربی اکبر علی عرق آب ہوئے اور قریب کے کسی ہندو راجہ نے ان کے اجداد کے گھر کو لوٹ لیا اور مولانا کی والدہ وغیرہ صغر سنی میں بے یار و مددگار ہوگئیں۔ مولانا نے یہ لکھا ہے کہ وہ راجہ کئی مہینوں تک گھر کا سامان گاڑیوں پر ڈھو کر منتقل کرتا ہے۔ مولانا نے جو روایت سنی اسے نقل کر دیا۔ انکو واقعہ کی تحقیق کر کے لکھنا چاہئے تھا کیونکہ تیرہ گانو کی زمینداری (اس وقت جب کہ گاؤں کی قیمت ڈیڑھ سو اور دو سو ہوا کرتی تھی) اتنی بڑی نہیں ہوتی تھی کہ سامان مہینوں ڈھلتا رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مولانا کے والد مولانا حبیب اللہ نے اپنا بچپن عسرت اور تنگ دستی میں بسر کیا۔ وہ ذہین تھے۔ انھوں نے تھوڑی سی تعلیم حاصل کی۔ نارمل اسکول سرٹیفکیٹ کا امتحان پاس کیا اور ٹانڈہ کے اسکول میں معلم ہوگئے۔ مولانا کے والد نے اپنے حسن انتظام اور خوش سلیقگی سے گھر کو دوبارہ سنبھالا۔ بہرکیف مولانا نے تفصیل سے اپنے والد والدہ اور نانا، نانی وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ان معلومات کی بنا پر مولانا کے خاندانی حالات اور گھریلو ماحول کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے جو خود نوشت نگار کے ذات کے اظہار میں بڑی حد تک معاون ہیں۔ مولانا کے والد حضرت فضل الرحمانؒ گنج مراد آبادی کے مرید تھے اور ان کو اپنے پیر سے بہت محبت تھی۔ اس لیے پیر کی وفات کے بعد انھوں نے ہجرت کا قصد کیا اور اپنے پورے خاندان کو لے کر

Marfat.com

مدینہ منورہ چلے گئے ۔ مولانا حسین احمد کو بھی اپنی مرضی کے خلاف والد کی خوشنودی میں مدینہ جانا پڑا ۔ اس طرح مولانا حسین احمد بھی اپنے والد کے ساتھ ۱۹۱۶ء میں مدینہ منورہ کے لیے ہجرت کر گئے مولانا نے اپنی یادداشت کے ذریعہ اس سفر اور مدینہ منورہ کی زندگی کا نقشہ پیش کیا ہے جو خاص اہمیت کا حامل ہے انھوں نے نہر زرقاء کی تاریخ اور اس کے پانی کی لذت اور لفظ زرقہ کی وجہ تسمیہ بیان کی ہے ۔ مدینہ منورہ کی کھجوروں کی قسمیں بیان کی ہیں ۔ جن میں عام طور پر چالیس اقسام بکثرت پائی جاتی ہیں ۔ مدینہ منورہ کے عوام کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ وہاں کے لوگ نرم طبیعت اور خوش اخلاق ہوتے ہیں مگر اپنے برابر کسی کو نہیں گردانتے ۔ ان دنوں اہل مدینہ منورہ کا گزر اوقات ان وظائف پر تھا جو دولت عثمانیہ سے مقرر ہوئے تھے اس کے علاوہ وظائف نواب بھوپال ، نواب حیدر آباد اور دیگر امرائے ہند کی طرف سے بھی دیے جاتے تھے ۔ مولانا نے وہاں کے معاشی اور اقتصادی حالات پر روشنی ڈالی ہے ۔ لیکن اپنی رائے کے اظہار سے گریز کیا ہے ۔ جو معاملات یا واقعات پیش آئے صرف ان کو تحریر کر دیا ہے ۔ اس لاتعلقی سے خود نوشت کو نقصان پہنچا ہے ۔ جس سے یہ بیان محض تاریخی نوعیت کا سپاٹ بیان ہو کر رہ گیا ہے ۔

مولانا حسین احمد ہندوستان کے علماء کی صف میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں ان کے مذہبی عقائد اور ان کے نظریۂ زندگی پر آج بھی نکتہ چینی کی جاتی ہے ۔ اس لیے ان کی خود نوشت سے ان کے مذہبی عقائد اور ذہنی رجحان کو اخذ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ۔

مولانا نے جو مذہبی عقائد اور واقعات بیان کیے ہیں ان کی روشنی میں یہ چند باتیں سامنے آتی ہیں :

(۱) مولانا پیری مریدی کے قائل تھے اور یہ سلسلہ ان کے خاندان میں عرصہ دراز سے قائم تھا ۔

(۲) وہ وہابی نہیں تھے ۔ انھوں نے وہابیوں کے عقائد پر سخت نکتہ چینی کی ہے ۔

(۳) وہ بزرگوں کی کرامت اور خرق عادات کو نہ صرف صحیح مانتے تھے بلکہ شرعاً

Marfat.com

جائز قرار دیتے تھے ۔

(۴) دست بوسی کو جائز سمجھتے تھے ۔

(۵) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے قائل تھے ۔

(۶) دربار رسالت میں حاجات کے لیے دعا مانگنے کو جائز سمجھتے تھے ۔

(۷) رسول خدا کے جود و عطا کے اختیار کو مانتے تھے ۔

(۸) توسل انبیاء و اولیاء کے نہ صرف قائل تھے بلکہ مفید سمجھتے تھے ۔

مولانا نے اپنی خودنوشت میں تحریر کیا ہے کہ حضرت مولانا فضل الرحمان صاحب گنج مرادآبادی نے ان کے والد کو کچھ تعویذ لکھنے کی اجازت دی تھی، اور وہ اجازت والد نے حسین احمد کو منتقل کر دی تھی ۔ لیکن مولانا نے یہ نہیں تحریر کیا ہے کہ وہ خود بھی کبھی تعویذ لکھتے تھے یا لوگوں کو دیتے تھے مجھے مولانا کے ایک خط سے یہ معلوم ہوا کہ وہ خود بھی ضرورت مند حضرات کو تعویذ دیا کرتے تھے ۔ مولانا عثمان مرادآبادی کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں:

"آپ کا خط مورخہ ۳ مئی باعثِ دلجمعی ہوا ۔ احوال مندرجہ سے آگاہی ہوئی عزیزم محسن صاحب سلمہٗ کی کیفیت سے بہت تشویش ہوئی ۔ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں صحت کاملہ عطا فرمائے ۔ بالفعل مندرجہ تین عمل کیجیے:

(۱) دیسی روشنائی سے مندرجہ ذیل اکتالیس نقش باوضو لکھیے اور پھر نقوش کی خانہ پری ترتیب وار ہوگی ۔" [۴۶]

آگے چل کر اس کو موم جامہ کرنے اور باندھنے وغیرہ کا ذکر ہے ۔ اس اقتباس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا دعا اور تعویذ کو نہ صرف جائز تصور کرتے تھے بلکہ وہ خود اس پر عمل کرتے تھے ۔

مولانا کی خودنوشت کے مطالعہ اور مندرجہ بالا عقائد کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ عقائد کی رو سے حنفی المشرب شرعی عالم تھے اور بعض دوسرے علماء کی طرح شدت پسند نہیں تھے ۔ اور سلسلۂ امدادیہ چشتیہ کے تعلق سے تصوف کے عقائد سے قریب تر تھے ۔

---

[۴۶] الجمعیت، دہلی شیخ الاسلام نمبر ۱۵ ر فروری ۱۹۵۸ء، ص ۱۷۱

Marfat.com

مولانا کی زندگی کا دوسرا رخ میدان سیاست ہے۔ وہ از خود سیاست کی اس خاردار وادی میں نہیں آئے بلکہ ان کے استاد محترم محمود حسن صاحب شیخ الہند نے انھیں اس طرف راغب کیا۔ اور انھیں انگریزوں کی وطن دشمنی نیز مسلم کشی نے مجبور کر دیا کہ وہ اس میدان میں اتریں۔ لیکن مولانا نے ۱۹۴۲ء کے مقدمۂ مراد آباد میں جو صفائی کا بیان دیا ہے وہ مولانا کے اس بیان سے قدرے مختلف ہے۔ ملاحظہ ہو:

" میں جب اسکول میں پڑھتا تھا تو مجھ کو تاریخ اور جغرافیہ سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوئی اور ہندوستان کی پرانی تاریخی عظمتوں اور جغرافیائی ہمہ گیر برکتوں نے نہایت گہرا اثر کیا اور پھر اہل ہند کی موجودہ بے کسیوں کا اثر روز افزوں ہوتا رہا۔ طالب علمی کے زمانے کے ختم ہونے پر مجھ کو آزاد ممالک عرب، مصر اور شام وغیرہ کی سیاحت اور قیام کی نوبت آئی۔ آزاد ملک کے باشندوں سے میل جول اور ان کے اوطان کی حالتوں سے آگاہی حاصل ہوئی۔ اس نے مجھ کو اپنے وطن کی محبت میں اور زیادہ مبتلا کر دیا اور اس احساس کو نہایت قوی کر دیا کہ آزادی کس قدر ضروری چیز ہے اور بغیر آزادی کے کسی ملک کے باشندے کس قدر بے بس اور اپنے وطن کی قدرتی فیاضیوں سے محروم ہوتے ہیں۔" [۴۷]

مندرجہ بالا بیان مولانا کی وطن دوستی، حب الوطنی اور بچپن کی نفسیات کا آئینہ دار ہے۔ یہ بیان انھوں نے عدالت کی روبرو دیا تھا۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس بیان میں مولانا نے مصلحت کوشی کے سبب بعض عوامل کا ذکر کیا ہے۔ لیکن انھوں نے اس مقام پر مولانا محمود حسن کا بالکل ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن مولانا نے جن باتوں کا ذکر کیا ہے ان کو بھی عقل سلیم تسلیم کرنے کو تیار ہو جاتی ہے۔ ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ بیان ۱۹۴۲ء میں دیا گیا یعنی دورِ غلامی میں، اور خود نوشت ۱۹۵۳ء میں لکھی گئی آزادی کے بعد اگر یہ محرکات

---

۴۷ الجمعیت، شیخ الاسلام نمبر ص ۱۱

Marfat.com

بھی خودنوشت میں بیان ہو جاتے تو بہتر تھا۔ میرے خیال میں متذکرہ بالا محرکات اور شیخ الہند کی تربیت ان سارے عوامل نے مل کر مولانا کے سیاسی ذہن کو پروان چڑھایا تھا۔ چونکہ مولانا حسین احمد مدنی پر مولانا محمود حسن کی تربیت کا اثر زیادہ تھا اس لیے انھوں نے اپنی خودنوشت میں محض مولانا محمود حسن کے ذکر پر اکتفا کیا ہے۔ اس سے خودنوشت پر اخفا یا غلط بیانی کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا ایسا لگتا ہے کہ مولانا نے انگریزوں کے ظلم وستم کی داستان اور علماء کے کارہائے نمایاں بیان کرنے کے لیے اپنی خودنوشت لکھی ہے۔ اس میدان میں مولانا نے خوب قلم کے جوہر دکھائے ہیں۔ اس اسلوب تحریر کے سبب خودنوشت میں ان کی ذات صرف ۵۲ صفحات تک بالواسطہ یا براہ راست نظر آتی ہے۔ اس کے بعد مولانا کی شخصیت پر اس دور کی سیاست غالب آجاتی ہے۔

حضرت مولانا محمود حسن کی زندگی کے مختصر تعارف سے سیاسی حالات کی ابتدا کی ہے — محمود حسن نے بہت کم سنی میں غدر ۱۸۵۷ء دیکھا تھا۔ اس کے کچھ ہلکے سے نقوش ان کی یادداشت میں محفوظ تھے۔ مولانا محمود حسن ۱۸۵۱ء یا ۱۸۵۲ء میں پیدا ہوئے اور چھ یا سات برس کی سن میں میرٹھ پہنچ گئے۔ جہاں ان کے والد ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں سے انگریزوں کے مظالم اور حریت اور آزادی کے پرستاروں کی جانبازی اور قربانی کو دیکھا تھا۔ انھوں نے مولانا محمود حسن کی علمی لیاقت اور جذبۂ حریت اور ایثار کو بڑے جامع انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا مدنی کی رائے بہت وقیع اور اہم ہے کیونکہ وہ مولانا محمود حسن صاحب کی جلوت وخلوت کے حاضر باش تھے۔ لکھتے ہیں:

> "وہ تمام اطلاعات جن کی وجہ سے انقلاب ۱۸۵۷ء کی کوششیں ہندوستانیوں نے کی تھیں اور وہ واقعات جو اس جنگ آزادی میں پیش آئے تھے معلوم ہو کر محفوظ ہو گئے تھے جن کی بنا پر وہ جذبۂ حریت و ایثار اور اس کی آگ اور امور حکومت پر تنقیدانہ نظر پیدا ہو گئی تھی جس کی نظیر بجز قرون اولیٰ عالم اسلام میں پائی جانی تقریباً ممتنع ہے۔" [۴۸]

---

[۴۸] نقش حیات، جلد اول، ص ۱۵۴

Marfat.com

مولانا نے اپنے استاد مولانا محمود حسن کی انگریز بیزاری اور ہندوستانی قوم کے لیے جذبۂ محبت و قربانی کے وجوہ بیان کئے ہیں ۔ ان میں :

(۱) انگریزوں کے ذریعہ ہندوستانی عوام کی تذلیل

(۲) انگریزوں کے ذریعہ ہندوستانی اقوام کے کردار کو گرا ہوا اور ذلیل قرار دینا۔

(۳) انگریزوں کی وجہ سے ملک کی تجارت و حرفت کو نقصان پہنچا۔

(۴) انگریزوں کا ہندوستانیوں کو تعلیمی میدان میں جاہل بنا دینا۔

(۵) ہندوستان کے باشندوں میں نفرت اور دشمنی پھیلانا۔

(۶) انگریزوں کا خاص طور سے مسلمانوں کو برباد کرنا وغیرہ خاص اسباب ہیں ۔ ان سارے معاملات کو مولانا مدنی اپنے استاد مولانا محمود حسن کے لیے انگریزوں کی طرف سے تنفر کے اہم اسباب سمجھتے ہیں ۔ مولانا مدنی نے یہ سارے الزامات خود نہیں تراشے بلکہ انگریزوں کی تحریروں سے اقتباس پیش کر کے اپنے دعویٰ کا ثبوت دیا ہے ۔ جن انگریزوں کی تحریروں کے حوالے مولانا مدنی نے دئے ہیں ، ان میں چند اہم نام یہ ہیں ـــ سر تھامس منرو ، میلکم لوئس ، لارڈ میکالے ، الگزنڈر ہملٹن وغیرہ ہیں ۔ مولانا نے اس کیفیت حال کو بیان کرنے میں جو تکنیک اپنائی ہے وہ دلچسپ اور اچھوتی ہے ۔ انھوں نے اپنے طرز سے کہیں کچھ نہیں کہا ہے بلکہ تاریخی شہادتوں کی روشنی میں انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان کی حالت کا نقشہ کھینچتے اور ان کی آمد کے بعد ہندوستان کی کیفیت بیان کرنے کے بعد انگریزوں کی تحریروں کے اقتباسات سے اپنی بات ثابت کی ہے ۔ اس سلسلے میں لارڈ میکالے کی تحریر کا اقتباس ملاحظہ ہو :

> "بات بات پر حلف لیے جاتے تھے درآں حالیکہ قسم کھانا آبرودار ہندوستانیوں کے نزدیک گناہ ہے ۔ اس کے علاوہ مشرق میں کسی شریف آدمی کے زنانہ مکان میں غیر مرد کا گھس جانا یا کسی عورت کو بے پردہ دیکھ لینا ناقابل برداشت ظلم سمجھا جاتا ہے جس کا بدلہ صرف خون سے لیا جا سکتا ہے ۔" [۴۹]

---

[۴۹] جلد اوّل، ص ۱۶۰

Marfat.com

اسی طرح جب عدلیہ میں انگریزوں نے گڑبڑ کی تو راجہ رام موہن رائے نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ مولانا مدنی نے انگریزوں کی پستیٔ کردار اور اخلاقی گراوٹ کو اپنی خود نوشت میں خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وارن ہیسٹنگس کے الفاظ ملاحظہ کیجئے:

" انگریز ہندوستان میں آکر بالکل نیا انسان بن جاتا ہے جن جرائم کی وہ اپنے ملک میں کبھی جرات کر ہی نہیں سکتا ہندوستان میں ان کے ارتکاب کے واسطے انگریز کا نام جواز کا حکم رکھتا ہے اور اس کو سزا کا خیال تک نہیں ہو سکتا۔"[۵۰]

مولانا مدنی نے انگریزں کے مظالم کے علاوہ انگریزوں کی آمد سے لے کر ان کے انخلار تک پوری تاریخ بیان کی ہے۔ ۱۸۰۲ء میں انگریزوں کا مختار عام ہونا، انگریزوں کی کمپنی کا ختم ہونا اور ملکہ وکٹوریہ کے حکم سے ہندوستان مملکت انگلشیہ میں شامل ہونا وغیرہ بہت کچھ بیان کیا ہے۔ ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ نے ایک اعلان خاص کے ذریعہ ملک ہند کا انتظام حکومت انگلستان کے زیر نگیں کر دیا اور ہندوستانی عوام کو یہ یقین دلایا کہ ہر طرح ان کے مذہب، عزت اور جان و مال کی حفاظت کی جائے گی۔ یہ بھی دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہندوستان جب اس قابل ہو جائے گا کہ وہ صمام حکومت سنبھال سکے تو حکومت انگلشیہ ان کو حکومت سونپ دے گی۔ اس اعلان میں ایسی سات شقیں شامل تھیں۔ مولانا مدنی نے ان اطلاعات اور معلومات کے ماخذ کی حیثیت سے جو کتابیں درج کی ہیں ان میں روح روشن مستقبل، امداد المشتاق، رسالہ تلک، ہندوستان ٹائمز، حکومت خود اختیاری، عالم المعیشہ، سوانح راجہ رام موہن رائے وغیرہ خاص ہیں جن سے مولانا مدنی کے ذوقِ تحقیق کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ مولانا نے ان سارے حالات اور عوامل کو پیش کرنے کے بعد علماء وقت یعنی حضرت عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے وارثوں کی قلمی جنگ اور جہاد یا تبلیغ کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا عبدالعزیز کا فتویٰ دارالحرب بہت اہم ہے جس کے سبب عوام و خواص میں ایک بیداری کی لہر دوڑ گئی تھی۔ امراء اور صاحب اقتدار اپنے حال میں مست تھے۔ ان میں کسی میں اتنی طاقت باقی نہیں رہ گئی کہ وہ اس

---

۵۰ جلد اول، ص ۱۴۶

Marfat.com

صورت حال کا مقابلہ کرتا۔ لہٰذا علماء اور فقہاء کو سیاست اور جہاد کا منصب سنبھالنا پڑا۔ شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ عبدالقادرؒ، مولانا سید احمد بریلوی، مولانا اسمٰعیل شہید وغیرہ اس کام میں لگ گئے۔ مولانا مدنی نے سید احمد شہیدؒ کی تحریک حریت اور ان کی عملی جنگ کا مفصل حال قلم بند کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد شہید کا مقصد انگریزوں کے خلاف جنگ کرنا اور انھیں ملک سے نکالنا تھا لیکن انگریزوں نے انھیں اپنی چالاکیوں سے مسلمانوں سے بعید ادیا۔ اس آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوبند کے اکابر علماء نے جنگ آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے پیر حضرت حاجی امداداللہ صاحبؒ مہاجر مکی نے مل کر ایک چھوٹی سی فوج ترتیب دی تھی۔ انھوں نے اس فوج کی مدد سے تھانہ بھون اور اطراف میں اسلامی حکومت قائم کر لی تھی۔ شاملی جو مظفر نگر کی تحصیل ہے وہاں پر بھی مجاہدین نے قبضہ کر لیا تھا۔ جنگ آزادی میں ہندوستانی مجاہدین ہار گئے اور انگریزوں کا تسلط قائم ہو گیا۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں کو عام طور پر اور مسلمانوں کو خاص طور پر کچلنا شروع کیا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی صدرالدین آزردہ، مولوی عبدالقادر صاحب وغیرہ گرفتار ہو گئے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور حضرت مہاجر مکی کی تلاش جاری ہوئی۔ مولانا مدنی نے ان حضرات کے سلسلہ میں جو واقعات بیان کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات اپنی روحانی کرامتوں کی وجہ سے انگریزوں کے جال میں پھنسنے سے بچ جاتے تھے۔ اس اسپرٹ کو مولانا محمود حسن نے آگے بڑھایا اور جب وہ مدینہ منورہ میں گرفتار کر کے مالٹہ میں نظر بند کر دیے گئے تو اس زمانہ کے حالات کو بھی مولانا حسین احمد نے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں رہائی کے بعد کے حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا محمود حسن نے ہندوستان کی آزادی کے لیے جن لوگوں کو افغانستان بھیجا تھا، ان میں مولانا عبیداللہ سندھی بہت اہمیت کے حامل تھے۔ مولانا مدنی نے مولانا سندھی کے مشن کا حال بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ انھوں نے شیخ الہند مولانا محمود حسن کی جامعہ ملیہ اسلامیہ میں آمد کا حال اور ان کی انگریزوں سے نفرت کا ذکر بھی کیا ہے۔ محمود حسن کو انگریزوں سے کس درجہ نفرت تھی ان کے ایک جملہ سے اس کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ مولانا محمود حسن بیمار تھے۔ وہ جامعہ کی تاسیس

Marfat.com

میں شریک ہونے کے قابل نہیں تھے لیکن جب انھیں بلایا گیا تو انھوں نے فرمایا اگر میری صدارت سے انگریز کو تکلیف ہوگی تو اس جلسہ میں ضرور شریک ہوں گا۔[۵۱] مولانا مدنی نے محمود حسن کی بیماری اور وصال کا حال تفصیل سے بیان کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمود حسن نے ۱۳۳۹ھ یوم سہ شنبہ کو دہلی میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے مکان پر وفات پائی۔ حسب وصیت جنازہ دیوبند لے جایا گیا اور حضرت مولانا نانوتوی کے مزار کے بغل میں دفن کیا گیا۔ چونکہ مولانا مدنی اپنے پیر و مرشد حضرت مولانا محمود حسن کے حکم سے کلکتہ کے لیے عازم سفر ہو چکے تھے، اس لیے وہ آخری رسومات میں شرکت سے محروم رہے۔ مولانا مدنی نے دوران قیام مالٹا عہد کر لیا تھا کہ اب وہ ہندوستانی سیاست میں عملی طور پر حصہ لیں گے۔ چنانچہ انھوں نے کانگریس کے باقاعدہ رکن بن کر آزادی کی جنگ میں عملی حصہ لیا اور ملک کو آزاد کرانے میں برادران وطن کے دوش بدوش کام کیا۔

مولانا حسین احمد مدنی کی پوری خود نوشت شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مولانا کوئی قرض اتار رہے ہیں۔ اس میں واقعات کا بیان تاریخی صداقت سے ملتا ہے لیکن جذبات کی آنچ اور تخیل کی رعنائی کا فقدان ہے۔ لیکن جہاں جہاں انھوں نے بارگاہ خداوندی میں عجز و نیاز کا نذرانہ پیش کیا ہے وہاں جذباتی کیفیت بھی ملتی ہے۔ یہ تحدیث نعمت ظاہری صورت میں بھی ملتی ہے اور بین السطور بھی۔ جاری و ساری محسوس ہوتی ہے۔ ظاہری صورت میں اس طرح کہ خود نوشت کا آغاز الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بارک وسلم سے ہوا ہے اور اختتام بھی شکر خداوندی پر ہے۔ واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین کی آیت پر ہے۔ مولانا مدنی نے حسب موقعہ، اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے کے لیے آیات و احادیث کو بے دریغ نقل کیا ہے۔ اپنی فتح و نصرت، اپنی نیکی و عبادت اور ریاضت کو بجائے تفاخر کے انکسار قرار دیا ہے اور عطیہ خداوندی گردانا ہے۔ انھوں نے کہیں بھی دامن عقل و دل کو معبود حقیقی کے کرم و عطا سے دور نہیں جانے دیا۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ خود نوشت اپنی داخلی اور خارجی خصوصیات کی بنا پر خالص مذہبی خود نوشت ہے۔ اس کا

---

[۵۱] نقش حیات، جلد دوم، ص ۲۵۶

Marfat.com

سیاسی پہلو بھی مذہبی عقائد اور اسلامی فکر سے وابستہ ہے۔

مولانا نے اپنی خودنوشت کا اسلوب واعظانہ اور ناصحانہ نہیں رکھا بلکہ اس کا اسلوب عالمانہ کہا جاسکتا ہے۔ اس میں واقعات کو حقائق کی روشنی میں مبالغہ اور فضول تمہید کے بغیر پیش کیا گیا ہے۔ اس آپ بیتی میں شعری زبان اور افسانوی انداز کی تلاش کار فضول ہے۔ مذہبی امور اور فکر کے اظہار کے لیے عربی الفاظ اور احادیث و قرآنی آیات کا استعمال ناگزیر ہوتا ہے۔ چنانچہ مولانا مدنی نے بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر جگہ جگہ قرآن کریم کی آیات اور احادیث کو نقل کیا ہے جس سے عبارت ثقیل ہوگئی ہے۔ اگر مولانا مدنی آیات و احادیث کے ترجمہ پر اکتفا کرتے تو قاری کا ذہنی رشتہ واقعات کی ترتیب سے قائم رہتا اور نثر میں روانی اور سلاست بھی باقی رہتی لیکن انھوں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ عبارت میں جہاں مذہبی نقطۂ نگاہ سے انتباہ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں یا سزا و جزا کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہیں، البتہ وہاں ان کا اسلوب بہت سادہ اور عام فہم ہوتا ہے مثلاً:

> "نسبی تفاخر اور غرور یقیناً نہایت قبیح مرض ہے جس کے ازالہ کے لیے اسلام نے انتہائی جدوجہد کی ہے۔ بارگاہ خداوندی میں عملی جدوجہد کی ہی پوچھ ہے۔ نسب بغیر عمل صالح اور بغیر اخلاق کاملہ اور عقائد صادقہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔" [۵۲]

مندرجہ بالا اقتباس ان کی نثر کا نمونہ ہے۔ ان کی آپ بیتی میں عام طور پر یہی اسلوب ملتا ہے۔ انھوں نے عربی و فارسی کے بعض ایسے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں جو نامانوس ہیں۔ مثلاً دروس، اوتان، ابحاث، شرحِ صدر وغیرہ کہیں کہیں عربی کی ایسی اصطلاحیں بھی ملتی ہیں جنھیں عام حالت میں سمجھنا محال ہے۔ رضا بالقضا، مذبوحانہ اضطراب، مستحضر وغیرہ۔

مولانا عربی و فارسی کے نامانوس الفاظ استعمال کرنے کے باوجود اپنے اسلوب میں سادگی اور دل نشینی برقرار رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس آپ بیتی میں حقائق کو سچائی کے ساتھ قلم بند کر دیا ہے اس لیے یہ خودنوشت سچائی کے زیور سے آراستہ ہے لیکن ایک تشنگی سی باقی رہتی ہے۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ مولانا حسین احمد اپنی پوری شرعی پوشاک اور عالمانہ خیالات کے ساتھ قاری کے سامنے آتے ہیں۔ ان

۵۲؎ نقشِ حیات، جلد اول، ص۱۱

Marfat.com

کی خانگی، داخلی اور نجی زندگی نگاہ سے اوجھل رہتی ہے۔ یہ تفصیلات آپ بیتی کے فن کے نقطۂ نظر سے سامنے نہیں آتی ہیں۔ مجموعی طور پر مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت سوانح حیات ایک مکمل اور بصیرت افروز آپ بیتی ہے۔ آپ کی آپ بیتی کے مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی کی زندگی ایک صاحب عزم اور بلند حوصلہ انسان کی زندگی تھی۔ ان کی دینی بصیرت اور دنیاوی سوجھ بوجھ بھی لائق تقلید ہے۔

ان کی خود نوشت میں واقعات کا اظہار سچا اور مخلصانہ ہے۔ یہی ایک اچھی خود نوشت کا امتیاز ہوتا ہے۔ چند جملوں میں کہا جا سکتا ہے کہ نقشِ حیات ایک مکمل مذہبی خود نوشت ہے لیکن اس میں مولانا مدنی کی شخصیت کے وسیلے سے ملکی سیاست اور جدوجہد آزادی کی تصویریں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

Marfat.com

آپ بیتی

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی شخصیت مذہب اور تصوف کی دنیا میں بے حد قابلِ قدر سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے ان کی آپ بیتی بھی اہم اور قابلِ قدر ہے اور آپ بیتی کا محرک مذہبی اور صوفیانہ جذبے کے علاوہ سوانح یوسفی بھی ہے۔ سوانح یوسفی مولانا محمد یوسف کی سوانح حیات ہے جس کے مرتب محمد ثانی ہیں۔ اس کتاب میں محمد ثانی کی فرمائش پر ایک باب مولانا علی میاں نے حضرت شیخ الحدیث کے حالات پر رقم فرمایا۔ ان حالات کو پڑھ کر شیخ نے سوانح یوسفی کے مولف محمد ثانی کو ایک خط تحریر کیا اور اس میں لکھا کہ جو باتیں ضروری تھیں وہ اس باب میں تحریر نہ ہو سکیں اور غیر ضروری باتیں لکھی گئیں یہ ایک مفصل خط تھا جو ان کی زندگی کے اہم حالات پر مشتمل ہے۔ شیخ نے یہ خط دوستوں کے اصرار پر ۱۵ ربیع الآخر ۱۳۸۸ھ کو آپ بیتی نمبر ا کے عنوان سے رسالہ اسٹرائک کا جز بنا کر شائع کر دیا۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ دوستوں اور مخلصوں نے اصرار کیا اور کہا کہ آپ اپنی زندگی کے باقی حالات بھی تحریر فرمائیں تاکہ ہم ان سے روشنی اور سعادت حاصل کر سکیں شیخ نے دوستوں اور شاگردوں کے تقاضوں اور فرمائش کو مدنظر رکھتے ہوئے آپ بیتی لکھنے کا آغاز کیا۔ اس زمانے میں شیخ الحدیث آنکھوں کے آپریشن کے سلسلے میں علی گڑھ میں مقیم تھے۔ اس آپ بیتی کے زیادہ تر حصے رات کے وقت تحریر ہوئے کیونکہ وہ یکسوئی اور فراغت کا وقت ہوتا تھا۔ دن کے ہنگاموں سے فرصت رہتی تھی۔ کاتب حضرات بھی رات کو زیادہ وقت صرف کر سکتے تھے لیکن شیخ نے کاتبوں کا نام کہیں نہیں لکھا ہے۔ اگر ان کے نام بھی معلوم ہو جاتے تو زیادہ بہتر تھا۔ شیخ نے اس آپ بیتی کی تحریر کا دن اور تاریخ بھی رقم کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

Marfat.com

"آج ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۹۰ھ مطابق ۲۶ اگست ۱۹۷۰ء چہار شنبہ کو بسم اللہ کرا دی۔ چونکہ ہر ایک گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد ڈاکٹروں کی آمد ہوتی تھی اور انجکشنوں اور معائنوں کا سلسلہ رہتا ہے اس لیے مسلسل وقت ملنا تو یہاں بھی دشوار ہے تاہم چونکہ یہ خیال ہے کہ خبر نہیں کہ یہاں کتنا قیام ہے اس لیے جو وقت بے کار جاوے اس میں کوئی کام کی چیز آجاوے۔"[۵۳]

اسی طرح شیخ الحدیث نے اپنی خودنوشت دوران قیام علی گڑھ لکھوائی۔ اس خودنوشت کے کاتب مختلف اوقات میں مختلف لوگ رہے۔ بہرکیف شیخ الحدیث نے اس خودنوشت پر سہارن پور آکر نظر ثانی کی اور اس کو طبع کرایا۔ اب شیخ الحدیث کی آپ بیتی چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ہر جلد میں دو ابواب ہیں اور آپ بیتی کا نام رسالوں کی مناسبت سے آپ بیتی نمبر ۱ اور آپ بیتی نمبر ۲ یا یادایام نمبر ۱ ہے۔ کل ملا کر ۵ آپ بیتیاں ہیں اور چار یادایام نمبر ہیں۔ ابتدا میں شیخ الحدیث اس آپ بیتی کو رسالہ کے انداز پر شائع کرانا چاہتے تھے لیکن انھوں نے احباب اور عقیدت مندوں کے اصرار پر اس کو ایک کتاب کے شکل میں شائع کرایا۔ یہ چاروں جلدیں ۱۳۹۰ھ سے لے کر ۱۳۹۱ھ کے اختتام تک شائع ہوئی ہیں۔

شیخ الحدیث نے اپنی آپ بیتی کو محض تحدیث نعمت اور طالبان حق کی رہنمائی کے لیے تحریر نہیں کیا بلکہ اس آپ بیتی کا کینوس زیادہ وسیع اور اس کی اپیل زیادہ دوررس ہے۔ انھوں نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے ان سے نکلنے والے نتائج تمام مہذب السالکوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ یہ کتاب بہت ضخیم نظر آتی ہے اور بظاہر واقعات اور حالات کی کثرت پر رطب ویابس کا گمان ہوتا ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے یہ بات ایک کمزوری ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شیخ نے بہت سے ایسے واقعات شامل کیے ہیں جن کے محذوف ہونے سے خودنوشت میں کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی ہے جو اس آپ بیتی کا محرک بھی ہے ذرا سے غور وفکر کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شیخ نے اپنی آپ بیتی افادہ عوام کی

---

[۵۳] آپ بیتی نمبر ۲، ناظم کتب خانہ یحیوی متصل جامعہ مظاہر علوم، سہارن پور ۱۹۷۰ء، ص۴

Marfat.com

غرض سے تحریر کی ہے۔ اس کے علاوہ اس آپ بیتی کے لکھنے کا مقصد بندگان خدا کی تلقین وہدایات کرنا بھی ہے۔ خصوصاً علماء نیز طلبائے مدارس کو علم دین کی عظمت اور اہمیت کی طرف ترغیب اور تشویق دلانا بھی ہے اس لیے طوالت اور تکرار ناگزیر تھی۔ خود شیخ الحدیث کو اس کا احساس تھا، لکھتے ہیں:

"یہ صحیح ہے کہ آپ بیتی جیسا کہ بار بار لکھا جا چکا ہے، تالیف مسلسل نہیں ہے علی گڑھ کے دو سفروں میں جب کہ علمی کاموں سے روک دیا گیا تھا پڑے پڑے کیف ما اتفق جو واقعات یاد آتے رہے لکھواتا رہا۔ بہت سے اہم واقعات چھوٹ گئے اور بہت سے واقعات بے ترتیب بھی آگئے اور بہت سے مکرر بھی ہو گئے۔"[۵۴]

شیخ الحدیث نے واقعات کے چھوٹنے، واقعات کی تکرار اور بے ترتیبی کا جو ذکر کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن اس تکرار اور تاکید کے پس پردہ، جو نیک مقصد کارفرما ہے، اس پر نگاہ رکھنی چاہئے۔ اس طوالت سے یہ فائدہ بھی پہونچا ہے کہ شیخ الحدیث کے زیادہ ملفوظات اور اقوال محفوظ ہو گئے ہیں جنھیں اہل نظر گنج پنہاں سمجھتے ہیں جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ آپ بیتی نمبر ا حرف بمولانا محمد ثانی کو خط کی شکل میں تحریر کی گئی ہے۔ آپ بیتی نمبر ۲ سے اصل خود نوشت کا آغاز ہوتا ہے۔ اس آیتِ کریمہ سے باب اوّل کی ابتداء ہوتی ہے...
فاعبد اللہ مخلصا لہ الدین ...... یعنی یہ آیت شیخ الحدیث کی خود نوشت کی تمہید کا سرنامہ ہے۔ جس خود نوشت کا آغاز خداوند ذوالجلال کی تعریف اور عبادت نیز خدا کی طرف لولگانے سے ہو، اس کتاب کی مذہبی، دینی اور روحانی افادیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ شیخ نے کسی مقام پر بھی قاری کو کہیں مایوس نہیں کیا ہے پہلا باب انما الاعمالُ بالنیات اور ان تعبد واللہ کانک تراہ (خدا کی عبادت اس طرح کرو جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو) کی تشریح پر مشتمل ہے اس تشریح میں شیخ نے عرفان وآگہی

---

[۵۴] آپ بیتی نمبر ۳، ص ۱۰۵

Marfat.com

کے خزانے لٹائے ہیں اور مختصر طور پر تصوف کی ابتداء انما الاعمال بالنیات کو قرار دیا ہے۔ اور اس کی انتہا ان تعبد اللہ کانک تراہ بتائی ہے۔ اس تشریح میں شیخ نے طریق شریعت اور طریقت دونوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ احادیث نیز اولیائے کبار کے ملفوظات اور واقعات کی روشنی میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان دنیا میں جو کام رضائے الٰہی کے لیے کرتا ہے ہر چند کہ اس کا ذاتی نفع بھی اس میں شامل ہوتا ہے، وہ عبادت ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سے واقعات نقل ہوئے ہیں۔ ایک حدیث پاک بھی نقل کی گئی ہے۔ یہ حدیث صدقہ کے باب میں ہے جس سے اقسام صدقہ پر روشنی پڑتی ہے شیخ کے الفاظ میں نقل کی جاتی ہے:

"آدمی میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں۔ جب آدمی صبح کو صحیح و سالم تندرست اٹھتا ہے تو ہر جوڑ کی صحیح و سلامتی کے بدلے اس کے ذمہ ایک صدقہ (شکرانہ) واجب ہوتا ہے۔ ایک دفعہ سبحان اللہ کہنا ایک صدقہ ہے۔ امر بالمعروف صدقہ ہے راستہ میں کوئی تکلیف دہ چیز کانٹا وغیرہ ہٹا دینا صدقہ ہے۔ آدمی اپنی بیوی سے صحبت کرے یہ بھی صدقہ ہے اور دو رکعت چاشت کی نماز ان سارے ۳۶۰ کا قائم مقام ہے"[۵۵]

مذکورہ بالا اقتباس سے اخلاص نیت، عمل صالح اور صدقہ کے وسیع ترین مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔ مختصر یہ کہ باب اوّل میں تصوف کی تعلیمات پر شرعی رخ سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا باب ان کی زندگی کے تجربوں کا حاصل ہے جس میں درس و تدریس کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی باب کے ذریعہ مصنف نے اپنی ذاتی زندگی کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے اس میں بچپن، لڑکپن اور جوانی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ روش عام سے ہٹ کر شیخ نے اپنی پیدائش کا حال یوں تحریر کیا ہے:

"اس ناکارہ کی پیدائش ۱۱ رمضان المبارک ۱۳۱۵ھ کی شب رات کو

---

۵۵ آپ بیتی نمبر ۲، ص ۲۰

Marfat.com

گیارہ بجے تراویح کے بعد ہوئی۔ جیسا کہ معروف ہے اس سیہ کار کا نسب نامہ مع اپنی ساری شاخوں اور سارے شجرۂ خاندان کے میری تاریخ کبیر میں بہت مفصل مشرح موجود ہے۔"[56]

اس اقتباس سے شیخ کی پیدائش کی تاریخ، دن اور وقت کا علم ہوتا ہے۔ ہر چند کہ شیخ نے یہ تحریر نہیں کیا کہ ان معلومات کا ماخذ کیا ہے لیکن جیسا کہ معروف ہے جملے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں یہ اطلاعات کسی بیاض سے حاصل ہوئی ہیں یا اپنے بڑوں سے پہنچی ہیں شیخ نے اپنے خاندان کے بارے میں صرف یہ اشارہ کیا ہے کہ بیاض کبیر میں مفصل درج ہے لیکن شیخ کے خاندان کے بارے میں اختلاف رائے ہیں۔ کچھ لوگ غلطی سے ان کو شیخ قطب شاہ علوی کیرانوی کی اولاد تحریر کرتے ہیں۔ لیکن شیخ کا سلسلہ نسب حضرت صدیق اکبر پر منتہی ہوتا ہے شیخ کا سلسلہ نسب انیسویں پشت میں حضرت قاضی ضیاء الدین سنامی سے ملتا ہے۔ اس طرح شیخ الحدیث صدیق الاصل شیخ ہیں اور قاضی ضیاء الدین سنامی کی اولاد ہیں[57] شیخ نے اپنے بچپن کی شرارتوں کے قصے بیان کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں شیخ عام بچوں کی طرح شریر تھے۔ انھیں نانی کے لاڈلے ہونے کے سبب کوئی روک ٹوک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ گنگوہ ڈھائی سال کی عمر میں آئے اور یہاں سید احمد صاحب (برادر بزرگ مولانا حسین احمد مدنی) کے کاندھوں پر سوار گھوما کرتے تھے شیخ کے گھرانے کا دستور تھا کہ ۵ سال کی عمر میں بچے کو پڑھنے بٹھایا جاتا تھا۔ لیکن شیخ سات برس کی عمر تک کھیلا کیے ان کی دادی اس بات پر خفا ہوتیں اور شیخ کے والد مولانا محمد یحییٰ کو بھی فہمائش کرتیں۔ لیکن مولانا محمد یحییٰ انھیں ٹال جاتے۔ اس بیان میں شیخ نے تحریر کیا ہے کہ ان کے والد یعنی مولانا محمد یحییٰ ایام شیر خوارگی میں پاؤ پارہ یاد کر چکے تھے اور سات برس کی عمر میں قرآن شریف حفظ کر چکے تھے۔

اس واقعے کو عام حالات میں غلو پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ دودھ پینے کے ایام کا عرصہ صرف ۲ برس ہے۔ ایک عام بچہ تین برس میں صحیح طور پر اپنا مافی الضمیر بھی ادا نہیں کر سکتا چہ جائے

---

۵۶ آپ بیتی نمبر ۲، ص ۲۴

۵۷ الفرقان، ماہنامہ لکھنؤ شیخ الحدیث نمبر، ستمبر تا دسمبر ۱۹۸۲ء، ص ۴۱-۴۰

Marfat.com

کہ قرآن کریم کا حافظ۔ لیکن چونکہ شیخ اس بات کے راوی ہیں اور شیخ کی پوری زندگی سچائی ہی سچائی ہے اس لیے اس بیان کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اس قسم کے واقعات استثنا کے زمرے میں آتے ہیں۔ مصنف نے اپنی ابتدائی تعلیم اور اپنے اساتذہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے لیکن ان تذکروں میں خاکہ نگاری یا سوانح نگاری کے عناصر نہیں پائے جاتے ہیں جب کہ دوسری خودنوشت سوانح عمریوں میں ایسے عناصر پائے جاتے ہیں۔ مولانا محمد زکریا نے اپنی تعلیم اور تربیت کا حال بڑی تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ اس تفصیل سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس زمانے میں مولوی حضرات کی تعلیم کا کیا طریق تھا اور اساتذہ کرام طالب علموں سے کس قسم کی مشقتیں لیتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن مظفر نگری کی اہلیہ نے انھیں قاعدہ بغدادی پڑھایا۔ پھر انھوں نے حافظ محمد صالح سے تبرکاً کچھ پڑھا۔ پھر حافظ رحیم بخش سے ڈھائی سی پارے پڑھے۔ اس کے بعد کسی سے قرآن پڑھنے کی نوبت نہیں آئی۔ شیخ کی دادی حافظ قرآن تھیں۔ وہ خود یاد کرتے اور انھیں سنایا کرتے تھے یا ان کے والد کسی لڑکے کو اپنے سامنے بٹھا دیتے اور یہ اپنا یاد کیا ہوا سبق سنا دیتے۔ اس طرح قرآن حفظ کر لیا۔ اور بقول خود ۱۳۲۸ھ سے ۱۳۸۰ھ تک ہر ماہ رمضان میں ایک کلام پاک ختم کیا کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا محمد الیاس سے فارسی اور اردو کا درس ۱۳۲۵ھ سے لینا شروع کیا۔ ان دنوں مولانا محمد الیاس خانقاہ قدوسیہ گنگوہ میں ذکر و فکر میں مشغول رہا کرتے تھے۔ شیخ نے شہر سہارن پور میں باضابطہ عربی کی تعلیم کا آغاز کیا۔ شیخ کے والد مولانا محمد یحییٰ کا طریق تعلیم دوسرے علماء سے مختلف تھا۔ شیخ نے اس کا حال تفصیل سے درج کیا ہے۔ انھوں نے اپنی طالب علمی کے زمانے کی کتابوں اور اوقات کار کا نقشہ بھی اپنی خودنوشت میں شامل کیا ہے۔ ان نقشوں سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ شیخ نے اپنی ابتدائی زندگی میں تعلیمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اگر مجموعی طور پر شیخ کی پوری حیات کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی شخصیت پر بچپن اور لڑکپن کی تعلیم و تربیت کا گہرا اثر ہے۔ ان کے ابتدائی ماحول اور تعلیم نے ان کی نفسیات کی تشکیل میں مدد دی ہے اور ان کے مزاج و کردار کو محنت، لگن اور باضابطگی سے آشنا کیا ہے۔ شیخ کے والد ایک دین دار انسان تھے مگر تہذیبی اقدار کو سخت گیری کی حد تک مانتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ لیکن وحشت ناک حد تک سبق آموز واقعہ کا ذکر شیخ کے والد کی سخت گیری کا آئینہ دار ہے۔ اس

Marfat.com

واقعہ کی روشنی میں شیخ کی تربیت کا حال بخوبی معلوم ہوتا ہے۔ شیخ کے والد شیخ کو جفاکش اور وضع فقرا کا پابند بنانا چاہتے تھے اور ان کی والدہ کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا جاہ وحشم کی زندگی بسر کرے۔ چنانچہ ایک بار جب ان کی والدہ کی طبیعت بے حد خراب ہوئی تو مولانا محمد یحییٰ نے شیخ کو ان کی والدہ کے پاس بھیج دیا۔ وہ اپنی زندگی سے ناامید ہوچکی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی دیرینہ آرزو پوری کرنے کے لیے شیخ کو قیمتی لباس اور جوتا منگا کر پہنایا۔ اتفاق سے اسی دن مولانا محمد یحییٰ بھی وہاں پہنچ گئے انھوں نے شیخ کو امیرانہ ٹھاٹ باٹ میں دیکھ کر ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ شیخ کی ہی زبانی سنیے:

> "مابدولت اس شاہی جوڑے کو پہن کر اور اس کی نمائش کرنے کے واسطے اپنے دروازے سے نکل رہے تھے۔ ایک دم ایک کی نگاہ دوسرے پر پڑی۔ ان کی نگاہ میں تو شیر ببر کی طرح سے خون کی لہر دوڑ گئی اور میں لنگور کے سامنے بندر ایسی حالت میں تھا کہ پاؤں کے نیچے زمین نہیں تھی اور انھوں نے للکار کر فرمایا کہ آگے آ۔ تعمیل کے سوا چارہ کیا تھا اور وہ نہایت نفیس اور مضبوط جوتا جو چار پانچ منٹ پہلے ہی پاؤں میں پڑا تھا وہ ان کے ہاتھ میں تھا اور بجائے پیر کے سر پر پڑ رہا تھا اور ایک لفظ زبان پر تھا کہ تجھے معشوق بننے کے واسطے بھیجا تھا .... بلا مبالغہ سو کے قریب تو سر پر پڑے ہی ہوں گے۔"[۵۸]

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ کو اپنے بچپن اور لڑکپن میں نفس کُشی اور سخت کوشی کا سامنا کرنا پڑا۔ آج کے سائنسی دور میں اس قسم کے واقعات کو کسی نفسیاتی الجھن کا نام دیا جاتا ہے اور عام سطح پر یہ واقعہ تربیت کا معاملہ نہیں بلکہ بچے کی خود اعتمادی اور حوصلہ کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن جس ماحول اور فضا میں شیخ کی تربیت ہوئی، یہ اس کے عین مطابق ہے۔ اس واقعہ کے بعد شیخ فرماتے ہیں کہ اس واقعہ سے مجھے اچھے کپڑوں سے نفرت ہوگئی ہے اور مجھے بن سنور کے رہنا اچھا نہیں لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

---

۵۸ آپ بیتی نمبر ۱، ص ۱۵

Marfat.com

شیخ کے والد انھیں شروع سے ہی تزکیۂ نفس اور عرفان آگہی کا سبق دینا چاہتے تھے۔ بہر کیف مولانا محمد یحییٰ کے عہد میں یہ اندازِ تربیت مذہبی گھرانوں کا طرہ امتیاز تھا لیکن آج صورتِ حال بالکل مختلف ہے۔ نظریات بدل چکے ہیں۔ کام کرنے کے طریقے اور نصب العین میں فرق آگیا ہے۔ آج کے دور میں یہ طریقہ غیر نفسیاتی اور بعید از فطرت خیال کیا جاتا ہے۔ مولانا محمد یحییٰ نے شیخ کو پڑھایا ہے اور انھیں فقہ و حدیث کی تعلیم خود دی ہے۔ ان کے والد ماجد کا خیال تھا کہ تو گستاخ ہے اگر اپنے استاد سے گستاخی کی تو علم جاتا رہے گا۔ اس لیے انھوں نے اپنے بیٹے کو خود ہی تعلیم دی اور اپنے خاص انداز میں ان کی تربیت بھی کی۔ اس کے بعد شیخ الحدیث نے مولانا ظفر احمد تھانوی سے نحومیر کے چند سبق پڑھے۔ منطق کے استاد مولانا عبدالوحید سنبھلی اور مولانا عبداللطیف ہیں۔ انھوں نے اپنی خود نوشت میں مولانا عبدالوحید کے حالات لکھے ہیں اور ان کے اندازِ تعلیم کا مختصر تجزیہ کیا ہے۔ مولانا محمد یحییٰ کا یہ کہنا کہ تو گستاخی کرے گا تو علم جاتا رہے گا، انتہائی بلیغ اور لائقِ توجہ ہے۔ اس بات سے ذہن فوراً حدیث رسول کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہے کہ جس سے علم حاصل کرو اس کی عزت کرو اور جسے علم دو اس پر شفقت کرو۔ اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس عہد تک تعلیم کا معیار سنت اور کتاب کے مطابق تھا۔ اور علماء اس بات کا بطور خاص لحاظ رکھتے تھے اور اب عجیب صورتِ حال ہے یونیورسٹیوں سے مذہبی درس گاہوں تک ایک سی فضا ہے، جہاں اسٹرائک سے لے کر بے ادبی تک ہر بات روا ہے۔

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

یہ بھی صحیح ہے کہ بد نظمی کے آثار مولانا کے عہد معلمی سے شروع ہو چکے تھے۔ ان کے دور میں اسٹرائکوں کا چکر چل چکا تھا، جس کی مخالفت میں شیخ نے رسالہ اسٹرائک جاری کیا تھا اور جس کے ایک جز کے طور پر ان کی خود نوشت آپ بیتی نمبر ا کے تحت چھپ چکی تھی۔ شیخ نے اپنی طالب علمی کے زمانے کے واقعات کثرت سے تحریر کیے ہیں جو نہ صرف سبق آموز ہیں بلکہ ان کی روشنی میں ذوق علم دین اور حرمتِ حدیث و قرآن بھی سمجھ میں آتی ہے۔ شیخ نے تحریر کیا ہے

Marfat.com

کہ تین چار گھنٹہ تک درس حدیث ہوتا اور ان کا کوئی ساتھی بغیر وضو کے حدیث شریف نہیں پڑھتا تھا۔ شیخ نے بیان کیا ہے کہ ان دنوں وہ ظہر کے وضو سے عشاء کی نماز ادا کرتے تھے۔ گویا عظمتِ حدیث اور حرمتِ علم دین ان کے دل میں جاگزیں ہو چکی تھیں۔ شیخ الحدیث نے اپنی علمی زندگی کا آغاز ۱۳۳۵ھ سے بہ عہدۂ معلمی کیا۔ ان دنوں شیخ کی عمر ۲۰ برس تھی۔ چنانچہ شیخ کی معلمی کی مخالفت میں لوگوں نے اعتراضات کئے، جن میں ایک اعتراض یہ تھا کہ ان کی عمر کم ہے، دوسرا اعتراض تھا کہ یہ حسین وجمیل ہیں۔ شیخ نے اپنی پیدائش اور حال میں یہ تحریر نہیں کیا کہ وہ صورت وشکل کے اعتبار سے کیسے تھے مگر مدرسی کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ وجیہہ اور پرکشش النسان تھے۔ شیخ نے اپنی معلمی کے تجربوں اور محنتوں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں مظاہر العلوم سہارن پور داخلی مولویانہ سیاست اور معاصرانہ چشمک کا شکار تھا اس درس گاہ میں شیخ کا تقرر پندرہ روپیہ یومیہ پر ہوا۔ شیخ نے پہلے سال جو کتابیں پڑھائیں، ان میں اصول الشاسی اور علم الصیغہ جیسی اہم کتابیں شامل ہیں، اس کے بعد انھوں نے ۵۵ برس تک علم دین اور فقہ وحدیث نیز ادبیات کا درس دیا۔ یہ بات کم اعزاز کی نہیں کہ مظاہر العلوم سہارنپور میں شیخ الحدیث کا عہدہ مولانا محمد زکریا کے لیے قائم ہوا جس کے ساتھ انھوں نے انصاف کیا۔ اپنی ۵۵ سالہ تدریسی زندگی میں شیخ نے ہر شعبۂ علم و دین کی خدمت کی۔ ان کا وقار بڑھتا گیا۔ انھوں نے پہلے صدر مدرسی اور پھر ناظم تعلیمات کا عہدہ بھی سنبھالا لیکن شیخ کی تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ان عہدوں سے خوش نہیں تھے بلکہ پریشان خاطر ہوتے تھے۔ ہر چند کہ ان کے مخالفین نے اندرونی اور بیرونی مخالفتیں کیں شیخ نے جہاں کہیں حاسدین اور مخالفین کا ذکر کیا ہے وہاں ان کا نام نہیں تحریر فرمایا ہے۔ اور برے الفاظ یا ہتک آمیز اسلوب نہیں اپنایا ہے۔ یہ خصوصیت شیخ کی شرافتِ نفس، انسانیت اور وسیع القلبی کی دلیل ہے۔ شیخ کی خودنوشت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیاوی منصب اور حرص وہوا سے یکسر بے نیاز تھے۔ ان کی طبیعت میں قناعت کا عنصر حاوی تھا۔ مولانا بدر الحسن جو ان دنوں لکھنؤ میں جج تھے، انھوں نے شیخ کی لیاقت علمی کو دیکھتے ہوئے انھیں علی گڑھ یونیورسٹی میں ناظم دینیات کا عہدہ قبول کرنے کے لیے پیشکش کی۔ اس عہدہ پر تین سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ تھا۔ اس عہدہ کو

Marfat.com

قبول کرنے کے لیے مولانا بدر الحسن نے ان کے اعزہ اور بزرگوں سے سفارشیں کروائیں۔ لیکن شیخ نے ۸ ہزار روپیہ کے مقروض ہونے کے باوجود اس ملازمت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

شیخ کے اقتصادی حالات کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اکلِ حلال پر بے حد توجہ دی اور عزتِ نفس کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ خداوند تعالیٰ عموماً اپنے اصحابِ حال و قال کا امتحان مصائب کے ذریعہ کرتا ہے اور پھر خوشحالی میں بھی آزماتا ہے لیکن شیخ کی تصویر کے دونوں پہلو تابناک ہیں۔ انھوں نے مالی پریشانیوں میں اللہ پر توکل اور مخلوق کے ساتھ تعلق کو برقرار رکھا اور جائز طریقہ سے اپنے متعلقین کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ وہ خوشحالی کے دور میں میانہ روی، انکسار اور شکرِ خداوندی سے کبھی غافل نظر نہیں آتے۔ شیخ کی خودنوشت سے اس دور کے حالات کا اندازہ نہیں ہوتا یا یوں کہیے کہ ان کے عہد کی جھلکیاں بہت کم نظر آتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ شیخ کا تعلق علماء اور فقہاء کے خاندان سے تھا۔ جہاں صرف شرع اور اس کے متعلقات ہی کا چرچا رہا کرتا تھا۔ دوسری طرف شیخ کے والد اور شیخ کے احباب بھی مدرس فقیہہ یا صالح قسم کے اشخاص تھے جو صرف مدرسہ اور خانقاہ کے درمیان زندگی بسر کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ شیخ کی پوری خودنوشت تعلیم دین اور انسانی اقدار کی تبلیغ کی بہترین دستاویز ہے۔ ان کی آپ بیتی میں اس عہد کے رؤسا، امراء اور عام آدمیوں کے رہن سہن، شادی و بیاہ کی رسموں خاندان اور برادری کی باہمی آویزشوں وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جب کہ خودنوشت سوانح نگاری میں ان باتوں کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے شیخ کی آپ بیتی سماجی سطح پر بالکل خاموش ہے۔ ان باتوں کی جگہ ان کی آپ بیتی میں ان مدرسین اور نیک بندوں کا ذکر ہے، جن کی علمی، دینی اور مذہبی فتوحات رضائے الٰہی اور اقامتِ دین کے سلسلے میں معاون اور مددگار تھیں۔ ایسا نہیں کہ شیخ کا تعلق ان اشخاص کے علاوہ دوسرے اصحاب علم و دولت سے نہیں تھا، ضرور تھا مگر شیخ نے شاید قصداً ان واقعات اور حالات کو تحریر نہیں کیا جس سے قاری کی نگاہ راہِ حق سے ہٹ کر، تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی، دنیا کی رنگینیوں میں گم ہو جاتی ہے شیخ نے اپنی آپ بیتی میں یوں تو بہت سے اشخاص کا تذکرہ کیا ہے لیکن چند اکابرین ایسے بھی ہیں جن کا ذکر تفصیل سے اور بار بار آیا ہے۔ ان میں شیخ کے پیر حضرت مولانا خلیل احمد مولانا عبدالرحیم رائپوری، مولانا حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے اسمائے گرامی خاص اہمیت

Marfat.com

کے حامل ہیں۔ شیخ نے اپنی آپ بیتی میں ان اصحاب کے قول و فعل اور واقعات کو بڑی تفصیل سے قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے یہ واقعات محض اس لیے تحریر کیے ہیں تاکہ قارئین کی رسائی ان اعلیٰ صفات اور اقدار تک ہو جائے جس کی تبلیغ شیخ کرنا چاہتے تھے۔ مولانا خلیل احمد کے معمولات خاص میں ان کے اوراد و وظائف، ان کا رجوع باللہ اور بندگان خدا کے ساتھ برتاؤ وغیرہ ہر چیز پر روشنی ڈالی ہے۔ شیخ نے اشرف علی تھانوی کی تصانیف اور ان کے نظریات کو اپنی آپ بیتی میں جگہ جگہ نقل کیا ہے۔ انھوں نے مولانا رائے پوری کے رشد و ہدایات کے واقعات لکھے ہیں ان کی خانقاہ کے نظام اور تبلیغ دین کے سلسلہ میں ان کے انہماک پر خاص توجہ صرف کی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ شیخ نے ان اکابرین کے واقعات اور حالات اس انداز سے تحریر کئے ہیں کہ اس میں قصہ کا لطف آتا ہے۔ یہ واقعات قصہ در قصہ کے انداز پر تحریر کیے گئے ہیں۔ لیکن پوری خود نوشت کے مزاج سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ نے صرف وہی واقعات تحریر کیے ہیں جو ان کے لیے کارآمد ہیں۔ دوسری خود نوشتوں کی طرح شیخ کی آپ بیتی میں اشخاص کے ناموں سے عنوانات قائم کر کے ان کے حالات قلم بند نہیں کئے گئے ہیں۔ اس انداز تحریر سے خود نوشت سوانح میں خاکہ نگاری کا رنگ اور عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ہر چند کہ شیخ کی آپ بیتی میں اشخاص کے ناموں سے عنوانات قائم نہیں کئے گئے۔ لیکن جن اشخاص کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے، ان کا پورا خاکہ قاری کے سامنے آجاتا ہے۔ انداز تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوشش شعوری نہیں ہے بلکہ موقع و محل کی مناسبت سے ہے۔ شیخ نے اپنی آپ بیتی کا محور تو اپنی ذات ہی کو رکھا ہے لیکن شیخ کی شخصیت اس آپ بیتی کے بین السطور میں نظر آتی ہے۔ اس کا سبب شیخ کا انکسار یا پھر تصوف کی طرف رجحان کہا جا سکتا ہے۔ ان کی خود نوشت کی چار جلدوں میں صرف ایک باب ایسا ہے جسے ہم شیخ کی ذاتی زندگی سے براہ راست وابستہ کر سکتے ہیں۔ باب کا عنوان ہے 'حوادث اور شادیاں' اس باب کے تحت شیخ نے چند اہم واقعات اور حادثات کا ذکر کیا ہے۔ اپنے والد ماجد کے انتقال اور ان کے چھوڑے ہوئے قرض کی ادائیگی کی تفصیل قلم بند کی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے والد کے انتقال کے وقت تو ان پر آٹھ ہزار روپئے کا قرض تھا۔ اس کی تفصیل شیخ نے ان الفاظ میں تحریر کروائی ہے:

Marfat.com

"میری زندگی کا سب سے اہم اور ابتدائی واقعہ میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا حادثہ انتقال جو ۱۰ ذی قعدہ ۳۴ھ کو ہوا۔ میرے والد صاحب قدس سرہ کے ذمہ انتقال کے وقت آٹھ ہزار روپئے قرض تھے جس کا کچھ حال تذکرۃ الخلیل میں حضرت میرٹھی لکھ چکے ہیں۔ مجھ پر اس قرض کا بہت ہی بوجھ تھا کہ جل شانہٗ کے یہاں مطالبہ نہ ہو۔" ؁۵۹

اس مقام پر شیخ نے اپنے والد کی بیماری اور انتقال کی پوری کیفیت تحریر نہیں کی ہے لیکن آپ بیتی نمبر ۵ میں تفصیل درج ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ کے والد ۹ ذی قعدہ جمعہ کے دن بعد نماز اسہال کے مرض میں مبتلا ہوئے اور دوسرے دن سنیچر کو انتقال کر گئے۔ انتقال کے وقت ذکر بالجہر میں مصروف تھے اور شیخ بھی ان کے ساتھ ذکر میں مشغول تھے۔ ان کی والدہ بھی والد کے انتقال کے دوسرے دن سے بستر علالت پر فروکش ہو گئیں۔ انھوں نے اپنی علالت کے دوران شیخ کا نکاح خاندان کی ایک لڑکی سے کر دیا۔ شیخ کے پیر نے ان کا نکاح بہت سادگی اور بغیر کسی رسم و رواج کے پڑھایا تھا۔ شیخ نے اپنے نکاح اول کا ذکر بھی مختصراً کیا ہے لکھتے ہیں:

"سب سے پہلے اس ناکارہ کی پہلی شادی ۲۹ صفر بروز دوشنبہ ۳۵ھ میں ہوئی۔ . . . . میری والدہ مرحومہ نے میرے والد صاحب نور اللہ مرقدہ کے انتقال جو ۱۰ ذی قعدہ ۳۴ھ کو ہوا۔ اس سے کچھ دنوں بعد میرے حضرت قدس سرہ کے پاس آدمی بھیجا کہ میری طبیعت خراب ہے زندگی کا اعتبار نہیں۔ میری خواہش یہ ہے کہ زکریا کا نکاح جلد ہو جاوے تاکہ گھر کھلا رہے۔ . . . . حضرت کاندھلہ تشریف لے گئے۔ یہ ناکارہ اور چچا جان اور حضرت کے دو خادم یہ جملہ بارات کاندھلہ پہنچی۔ میرے حضرت نے نکاح پڑھایا۔ اس وقت تک ہمارے خاندان

؁۵۹ آپ بیتی نمبر ۳، ص۵۷

Marfat.com

کا مہر اسی ہزار ٹکے دو دینار زر سرخ تھا۔ یہی عام طور سے نکاح میں ہوتا تھا۔ حضرت نے نکاح کی ابتداء میں مہر دریافت کیا تو یہی بتلایا گیا حضرت نے لاحول پڑھی اور فرمایا کہ روپئے بتاؤ۔ اتنے میں حضرت نے خطبہ پڑھا کسی نے جلدی سے ڈیڑھ ہزار کہہ دیا اور حضرت قدس سرہ نے میرا نکاح ڈیڑھ ہزار میں پڑھ دیا۔" ۶۰

مندرجہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کی شادی اسی سال ہوئی تھی جس سال ان کے والد کا انتقال ہوا تھا اور ان کی پہلی بیوی خاندان ہی کی تھیں۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کے نکاح کے وقت مہر کی رقم وہی باندھی گئی تھی، جو اس دور کے شرفاء کے گھرانوں کا عام دستور تھا۔ نکاح کے اس بیان میں شیخ نے اپنی آپ بیتی میں بہت کام کی باتیں بیان کی ہیں جن کا تعلق عام امتِ مسلمہ سے ہے۔ شادی بیاہ کی رسموں اور دستور کے سلسلہ میں شیخ کے یہ الفاظ لائقِ عمل ہیں:

"نکاح ایک عبادت تھی جس کو لوگوں نے ایک مصیبت بنالیا۔ علماء نے لکھا ہے کہ دو عبادتیں ایسی ہیں کہ جو حضرت آدم علیٰ نبینا و علیہ الصلوٰۃ والسلام سے شروع ہو کر قیامت تک بلکہ جنت میں بھی باقی رہیں گی۔ ایک ایمان دوسری نکاح، نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ نکاح میری سنت ہے جو میری سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں مگر ہم لوگوں نے اس بابرکت سنت میں بیجا لغویات شامل کر کے اس کو ایک مصیبت عظمیٰ بنالیا۔" ۶۱

یہ مختصر اقتباس ہے۔ لیکن شیخ نے اس بارے میں تین چار صفحات میں مزید روشنی ڈالی ہے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی شادی کا قصہ بیان کیا ہے اور پھر احادیث نبوی سے یہ ثابت کیا ہے کہ جو شادی جس قدر سادی اور ہلکی پھلکی ہوتی ہے وہ زیادہ مبارک ہوتی ہے نکاح

---

۶۰ آپ بیتی نمبر ۳ ص ۱۴۱ ۶۱ ایضاً ص ۱۳۸

Marfat.com

کے اس بیان سے یہ پتہ نہیں چلتا ہے کہ کاندھلہ میں ان کی شادی کس کی دختر سے ہوئی اور بیوی کا اسم گرامی کیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس کا ذکر شیخ الحدیث نے بیاض کبیر میں کیا ہو ــــــ بہرکیف شیخ کا پہلا نکاح ان کے خاندان ہی میں مولانا رؤف الحسن کاندھلوی کی صاحبزادی امت المتین سے ہوا۔ ان کے بطن سے پانچ لڑکیاں تولد ہوئیں۔ دوسرا نکاح شیخ نے اپنی چچازاد بہن عطیہ بیگم بنت مولانا محمد الیاس سے کیا۔ ان بیوی سے دو بیٹیاں صفیہ، خدیجہ اور ایک بیٹے محمد طلحہ تولد ہوئے[۶۲]۔ شیخ نے اپنی ہمشیرہ، بیٹوں اور بیٹیوں کو ملا کر سولہ سترہ شادیاں اپنے ہاتھوں سے کیں شیخ نے خاندان والوں کے طعن و تشنیع کے باوجود شادیوں میں اتباع سنت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ انھوں نے اپنی ہمشیرہ اور بیٹیوں کی شادی اپنے خاندان ہی میں کی لیکن انتہائی سادگی کے ساتھ۔ بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے لڑکیوں کو صرف نکاح کر کے رخصت کر دیا۔ جہیز تو کجا ضروریات زندگی کا کوئی سامان بھی نہ دیا لیکن ان کی رائے یہ ہے کہ جہیز میں بقدر ضرورت برتن دئے جا سکتے ہیں البتہ زیور کا دینا پسندیدہ ہے اور زیور بھی ایسا ہو جس میں مالیت زیادہ اور گڑھائی کم ہو شیخ نے جتنی شادیاں کیں ان کی تفصیل پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شادیاں کیا تھیں گڑیا اور گڈے کا کھیل تھا۔ دولہا سے کہہ دیا کہ فلاں وقت آجانا اور اکابرین میں سے کسی سے نکاح پڑھوا دیا۔ نہ بارات نہ شور و غوغا۔ نہ کسی عزیز و قریب کو اطلاع۔ گویا شادیاں بھی روزمرہ کے کاموں کی مختلف کڑیاں تھیں۔ یہ امر شیخ کے ذاتی مزاج اور طریقہ کا مرہون منت ہے۔ ورنہ اس قسم کی شادیاں نہ پہلے رائج تھیں نہ اب رائج ہیں۔ شیخ کی ذاتی زندگی کا دوسرا رخ جو آپ بیتی کے وسیلہ سے ہم تک پہنچا ہے۔ وہ ہے ان حادثات کا ذکر جو اولاد اور اکابرین کی اموات سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی والدہ کی موت کی تفصیل، پہلی اہلیہ کی وفات کا ذکر اور نوزائیدہ بچوں کی اموات کا تذکرہ شامل ہے۔ آپ بیتی سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو ان اقرب ترین رشتوں سے اس قدر لگاؤ نہیں تھا جو ایک عام انسان کو ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ان واقعات کو

---

[۶۲] الفرقان، ماہنامہ، لکھنؤ، ستمبر تا دسمبر، ۱۹۸۲ء، ص ۸۸

Marfat.com

بیان کرنے کا انداز سپاٹ اور سیدھا سادا ہے۔ اس میں حزن یاس کی کیفیت شامل نہیں ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ والدہ کے وصال پر اور اہلیہ کی رحلت پر شیخ کو صدمہ نہ ہوا ہو یہ بعید از فطرتِ انسانی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیخ صبر و شکر کی منزل میں تھے اور اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ منزلِ تسلیم و رضا میں بندہ اپنے رب کے ہر حکم پر بصد صبر و شکر سر نیاز جھکائے رکھتا ہے۔

شیخ نے اکابرین کی وفات کے جو حالات درج کئے ہیں وہ اس لیے قیمتی ہیں کہ ان حضرات کی صحیح تاریخ وصال اور مفصل حالات کی دستاویز ہیں۔ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے وصال کے حالات تحریر کئے ہیں۔ ان کا وصال ۱۱ اگست ۱۹۰۵ء جمعہ کے دن چاشت کے وقت ہوا جمعہ کے بعد تدفین عمل میں آئی۔ شیخ کا بیان ہے کہ فضاؤں پر سکوت طاری تھا ہر طرف قرآن خوانی ہو رہی تھی لیکن اتنی آہستگی سے کہ آواز کا نام و نشان نہیں تھا۔ شیخ ان کی قبر تک نہیں پہنچ سکے کیونکہ ان کا بچپن تھا۔ دوسرے تقریباً ایک میل کا رقبہ لوگوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کے بعد حضرت عبدالرحیم رائپوری کے وصال کا حال لکھا ہے کہ ان کا وصال ۲۶ ربیع الثانی ۳۷ھ میں بیلون میں ہوا اور جنازہ رائے پور لے جایا گیا۔ مولانا حسین احمد مدنی کی علالت اور امراض نیز حکیموں اور ڈاکٹروں کے معالجہ کا بالتفصیل ذکر ہے۔ ان سارے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے ان حادثات (بقول خود) میں بھی صابر و شاکر رہے اور اپنے معمولات میں فرق نہیں آنے دیا۔ ان باتوں سے شیخ کی جواں ہمتی اور توکل باللہ پر روشنی پڑتی ہے۔ شیخ نے اپنی ذاتی زندگی سے متعلق جو حالات تحریر کئے ہیں ان میں شیخ نے ایک باب "بندہ کی چند بری عادتیں" کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔ ان بری عادتوں میں شیخ نے جو واقعات بیان کئے ہیں ان کو نقل کرنا طوالتِ بیجا کے مترادف ہوگا۔ مختصراً ان عادتوں کو ہم نمبروار یوں گن سکتے ہیں:

(۱) شیخ مہمان کے آنے پر اس سے پہلا سوال یہ کرتے تھے کہ قیام کب تک ہے؟

(۲) مہمان کے قیام پر اصرار بالکل نہیں کرتے تھے بلکہ فوراً جانے کی اجازت دیدیتے تھے۔

(۳) وقت معین سے زیادہ کہیں قیام نہ کرنا خواہ اصرار شدید ترین ہو۔

Marfat.com

(۴) اگر شیخ کے مہمان کی کوئی دعوت کرے اور شیخ کو معلوم ہو کہ مہمان راضی ہے تو وہ مانع نہیں ہوتے اور اگر مہمان کا منشا نہ ہو تو شیخ دعوت کو رد کر دیتے۔

(۵) مہمان کے مہمل جواب (جب تک حکم ہو ٹھہروں) سے الجھن ہوتی۔

(۶) میٹھے سے نفرت اور گوشت سے رغبت

(۷) سفر سے نفرت

(۸) سفارش سے وحشت وغیرہ۔

شیخ نے جن عادتوں کو بری عادتوں میں شمار کیا ہے، وہ سرسری نظر سے دیکھنے میں دائرہ اخلاق سے خارج معلوم ہوتی ہیں لیکن نگاہ غور سے دیکھنے پر بہت اعلیٰ معلوم ہوتی ہیں۔ مہمان سے یہ معلوم کرنا کہ اس کا قیام کب تک ہے۔ مہمان اور میزبان دونوں کے لیے بہتر ہے۔ میزبان اپنے اوقات کو اس طرح بنا لیتا ہے کہ مہمان کی خاطر و مدارت ہو سکے جس کا ذکر شیخ نے بار بار کیا ہے۔ مہمان سے بے جا ادب بھی اچھے اخلاق کی دلیل نہیں اور اس ضمن میں جتنی عادتوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ سب کی سب بری نہیں بلکہ اچھی اور بہت اچھی ہیں۔ یہ شیخ کی سیرت کا ایک عدیم المثال رخ ہے۔

شیخ نے دین کی جو خدمت کی اس کا ذکر اجمالاً کیا ہے لیکن انھوں نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ جو خدمات انجام دی ہیں وہ بہت اہم ہیں۔ اس کی تفصیل آپ بیتی میں اس طرح موجود ہے کہ قاری بآسانی کتاب کے نفس مضمون تک پہنچ جاتا ہے۔ شیخ نے اپنی تصنیف و تالیف کا آغاز درس و تدریس کے دوسرے سال سے شروع کر دیا تھا...... سب سے پہلی کتاب شرح الفیہ اردو ہے اسی طرح تقریباً ۸۳، ۸۴ کتابیں شیخ کے علم و بصیرت کے ثبوت میں موجود ہیں۔ اس آپ بیتی میں ان کتابوں کا اجمالاً تعارف اور وجہ تالیف بیان کی گئی ہے۔ ان بیانات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شیخ کی طبیعت ابتدا ہی سے ادب و علم کی طرف راغب تھی اور انھوں نے اپنی مذہبی بصیرت کو عام کرنے اور علم دین کو مسلمانوں تک پہنچانے کی پوری کوشش کی ہے۔ اور اس کوشش میں وہ انتہائی کامیاب اور باثمر بھی ہوئے ہیں۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے شیخ کی علمی اور ادبی جامعیت پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے۔

Marfat.com

" عام طور پر جو لوگ علمی اور تحقیقی طرز کے عادی ہوتے ہیں وہ خالص دعوتی و اصلاحی اور عام فہم طرز پر تصنیف و تالیف کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے، اور جو دوسری طرز کے عادی ہوتے ہیں، وہ پہلے طرز میں اس کے آداب و معیار کو قائم نہیں رکھ سکتے، لیکن شیخ کی دونوں طرز کی تصنیفات مؤثر اور کامیاب ہیں .... اس طرح شیخ بیک وقت مصنف و محقق بھی نظر آتے ہیں، اور شارح حدیث اور مورخ بھی معلوم ہوتے ہیں، اور خالص داعی، مفکر اور مختلف طبقات امت کے ان کی زبان میں مخاطب کرنے والے مصلح بھی نظر آتے ہیں۔" [۶۳]

شیخ الحدیث کی آپ بیتی پڑھ کر مولانا ابوالحسن علی ندوی کی رائے سے پوری طرح اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ شیخ کی آپ بیتی ایک طرف دین کی دعوت دیتی نظر آتی ہے تو دوسری طرف اپنی معلومات کی بنا پر تاریخی دستاویز لگتی ہے۔

شیخ الحدیث ارکان دین کے سختی سے پابند تھے۔ انھوں نے پانچ حج کئے جن کی تفصیل آپ بیتی میں موجود ہے۔ شیخ نے ۳۸ھ میں پہلا حج مولانا خلیل احمد کی ہمرکابی میں کیا۔ دوسرا اور تیسرا حج ۴۸ھ اور پانچواں ۱۳۹۰ھ میں کیا۔ شیخ نے اپنی آپ بیتی میں ان اسفار کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ان کو پڑھنے سے اس دور کے عرب کا نقشہ ہماری نظروں میں پھر جاتا ہے۔ اور وہاں کے باشندوں کے طرز بود و ماند اور اخلاق و عادات سے آگاہی ہوتی ہے۔ انھوں نے حرمین شریف میں تراویح کے اوقات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ عشاء کی نماز ڈھائی بجے ہوا کرتی تھی اور حرم والے رمضان میں مغرب اور عشاء کے بیچ کافی فرق رکھتے تھے۔ شیخ نے پہلے سفر حج کی تفصیلات اس انداز سے بیان کی ہیں کہ اس دور کے عرب کی اقتصادی حالت اور وہاں کے حکمرانوں کی کوتاہیاں آئینہ ہوجاتی ہیں۔ لکھتے ہیں :-

---

[۶۳] حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ، بار اول دسمبر ۱۹۸۳ء، ص ۲۵۳-۲۵۴

Marfat.com

"شریف کا زمانہ تھا نہایت بد نظمی کا ہم لوگوں نے مکہ سے جدہ تک کوئی اونٹ نہیں کیا بلکہ منیٰ عرفات میں کسی جگہ نہیں کیا۔ بلکہ حضرت قدس سرہٗ کے اونٹ کے ساتھ پیدل چلتے رہے اور بے فکری سے کبھی ادھر ادھر بھی ہو جاتے تھے۔ میں شوق میں کچھ آگے بڑھ گیا۔ حضرت قدس سرہٗ نے بلا کر خوب ڈانٹا اور فرمایا کہ اونٹ کے ساتھ رہو ذرا ادھر ادھر نہ ہو۔ پیشاب وغیرہ کے واسطے بھی دور نہ جاؤ کوئی بدو تم کو مار کر کپڑے وغیرہ سب اتار لے گا"[۶۴]

مندرجہ بالا اقتباس سے شریف کے دور کا عرب نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ٹھیک یہی حالات مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی خود نوشت میں تحریر کئے ہیں۔ اس لیے بیان میں کسی قسم کی افراط و تفریط کا شائبہ نہیں ہے۔ شیخ نے ایک بار عربی گدھے پر بھی شوقیہ سواری کی تھی۔ عربی گدھے کا خاکہ اور اس کی رفتار کا حال شیخ کے الفاظ میں سنئے:

"ایک بار عربی گدھے پر سوار ہونے کا شوق پیدا ہوا۔ نہایت ہی خوبصورت اور آنکھیں ہرنیوں کی آنکھوں کے مانند نہایت ہی حسین اور اوپر نہایت ہی خوشنما لال رنگ کی دھاریاں مگر وہاں کا دستور یہ تھا کہ حاجی کو گدھے پر بٹھا کر گدھے کا مالک اس [illegible] ایک ڈنڈا مار دیتا ساتھ جانے کا دستور نہیں تھا نہ اس میں لگام اور نہ چار جامہ۔ وہ گدھے اس قدر سدھے ہوئے تھے کہ باب العمرہ سے جو ایک دوڑ لگاتے تھے تو مسجد تنعیم پر جا کر سانس لیتے تھے۔ چاہے سوار ان کے اوپر ہو چاہے گر جاوے آدھ گھنٹہ وہاں ٹھہر کر گدھا سیدھا باب العمرہ پر واپس آجاتا تھا"[۶۵]

شیخ نے دوسرے سفر حج کے واقعات میں لکھا ہے کہ وہاں ۱۹۲۰ء میں مرغی کا بھاؤ ۲ آنے فی مرغی تھا اور ایک پیسے کے کئی کئی انڈے ملتے تھے۔ اس لیے دوران سفر بلکہ کامران میں سب نے مرغیاں اور انڈے خریدے۔ گویا چیزوں کی قیمتیں ارزاں تھیں اور تمام

---

[۶۴] آپ بیتی نمبر ۴، ص ۲۱۸ [۶۵] ایضاً، ص ۲۱۹

Marfat.com

معاشرہ قلتِ زر کا شکار تھا۔ شیخ کے پانچوں حجوں کے بیان میں ثقافتی، مذہبی امور بیان ہوئے ہیں اور کہیں کہیں بہت معمولی سی سیاسی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

شیخ نے پانچواں باب تحدیث بالنعمت کے عنوان سے لکھا ہے۔ درحقیقت یہ باب شیخ کی زندگی کے ان حالات پر مشتمل ہے جسے ہم تعلق باللہ کہہ سکتے ہیں اور اس باب میں مختلف بزرگوں سے ملاقاتوں اور ان کے فیوض و برکات کا ذکر ہے۔ اس باب میں ایسے واقعات ہیں جن کو پڑھ کر ایک طرف تو شیخ کی روحانی اور اخلاقی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے دوسری طرف وہ رازافشا ہوتے ہیں جنھیں عام طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر شیخ نے حدیث کے حوالہ سے تنبیہ کی ہے کہ جو شخص کسی کو گناہ کے ساتھ عار دلاتا ہے وہ مرنے سے پہلے اس میں ضرور مبتلا ہوتا ہے یا ایک جگہ تحریر فرمایا ہے کہ اللہ والوں سے ڈرو ان کی الٹی بات بھی سیدھی ہوتی ہے۔ اور پھر اس کی توجیہہ حضرت عبدالرحیم رائپوری کے الفاظ میں یہ بیان کی ہے کہ اگر کسی جھوٹی بات سے بھی اللہ والوں کا دل آزردہ ہوتا ہے تو ان کی آزردگی رنگ لاکر رہتی ہے۔

شیخ الحدیث کی آپ بیتی کی امتیازی خصوصیت اس کا مذہبی مزاج ہے۔ انھوں نے تمام حالات اور واقعات کا انتخاب اسی خصوصیت کے تحت کیا ہے۔ انھوں نے اپنی خودنوشت کو ایسی دستاویز بنا دیا ہے جو علمائے سلف کے عقائد، تصرفات اور طرزِ زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بڑے بڑے علمی اور فقہی مسائل کو عام فہم انداز میں پیش کیا ہے اور بزرگوں نیز علماء کے قصّوں سے ثبوت پیش کئے ہیں۔ شیخ نے جو مسائل اپنی خودنوشت کے ذریعہ حل کیے ہیں ان میں تصوف، طریقت، شریعت، علم اور رزقِ حلال شامل ہیں۔ دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ مولانا کی خودنوشت علمی اور دینی نہج پر مسلمانوں کے لیے مشعلِ ہدایت ہے۔ شیخ نے اپنی خودنوشت کا آغاز تصوف سے کیا ہے اور خودنوشت کا اختتام بھی علم تصوف کی حقیقت و مآخذ کے عنوان پر ہوتا ہے اس لیے ان کی آپ بیتی کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے نظریۂ تصوف کا بطورِ خاص جائزہ لیا جائے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شیخ کے مزاج اور عادات میں عملی تصوف گھر کر گیا ہے۔ اس لیے ان کی خودنوشت میں تصوف کا عنصر لہو کی طرح دوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں سے صوفیاء کی تعلیم

Marfat.com

کی خوشبو پھوٹتی ہے۔ تصوف کے بارے میں ان کا نظریہ پہلے ہی پیش کیا جا چکا ہے۔ اب شیخ کی رائے علمی دلائل کی روشنی میں پیش کی جاتی ہے۔ شیخ نے تصوف کے ماخذ اس کی روح اور طریق کے بارے میں حضرت ابو یحییٰ زکریا کے قول کو نقل کیا ہے۔ شیخ کے نزدیک اصل تصوف یہی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"اور یہ حضرات جو صفات بالا کے ساتھ متصف ہیں مقربین کہلاتے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جو صفت احسان کے ساتھ متصف ہیں۔ امت کے لوگوں کے درجات مختلف ہیں، بعض اصحاب یمین کہلاتے ہیں اور بعض کو مقربون کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ خود قرآن حکیم میں آیا ہے۔ لہذا جن کا ایمان درست ہو گیا اور انھوں نے مامورات شرعیہ پر عمل کیا وہ اصحاب یمین کہلاتے ہیں اور جس کی غفلات کم ہو گئیں اور نوافل میں دوام اور استمرار اس کو حاصل ہو گیا اور اس کی طاعات کثیر ہو گئیں اور ذکر اللہ کا قلب پر استیلا ہو گیا اور اپنی تمام حوائج میں حق تعالیٰ کی جانب رجوع ہونا اور اسی سے دعا کرنا جس کا حال بن گیا وہی مقرب کہلاتا ہے اور اسی شخص کو محسن کہا جاتا ہے اور اسی کو صوفی بھی کہا جاتا ہے جو صفا سے مشتق ہے۔ یعنی یہ شخص اخلاق مذمومہ سے پاک وصاف ہو گیا اور اخلاق محمودہ کے ساتھ متصف ہو گیا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو محبوب بنا لیا اور جملہ حرکات اور سکنات میں اس کا محافظ اور نگراں ہو گیا"[۶۶]

مندرجہ بالا عبارت نقل کرنے کے بعد شیخ نے قرآن کی اس آیت کا حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اس طرح کے بندوں کا ہاتھ، آنکھ، کان غرض اس کا ہر فعل میری مشیت پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی سلسلے میں شیخ نے سیکڑوں صحابہ، تابعین، تبع تابعین، محدثین فقہاء اور صوفیاء کا تذکرہ کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

۶۶۔ آپ بیتی نمبر ۶، ص ۵۱ - ۵۰ - ۴۸

Marfat.com

"یہاں تک کہ ہر فریق دعویٰ کرنے لگا کہ ان کے اندر زہاد ہیں۔ یہ دیکھ کر خواص اہل اللہ اہل اللہ نے کہ اپنے لیے معیت الٰہیہ کو تجویز کیا اور جنھوں نے اسباب غفلت سے اپنے قلوب کی حفاظت کی انھوں نے اپنے مسلک اور طریق خاص کے لیے اسم تصوف تجویز کیا۔ چنانچہ اسی جماعت کے اکابر دو سو ہجری سے پہلے پہلے مشہور ہو گئے۔ یعنی انہی حضرات کو صوفی کہا جاتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ تصوف کا نام اگرچہ بہت دلوں کے بعد زبان پر آیا تاہم اس کا مصداق اسلام کے قرون اوّل میں بھی موجود تھا۔"[۶۷]

شیخ کے ان بیانات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ شیخ تصوف کو روح ایمان اور اساس اسلام مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک تصوف قرآن حکیم سے ماخوذ ہے جس کو اسلام کے ابتدائی دور میں احسان کہا جاتا تھا، اور جو ظاہر و باطن کی تعمیر کرتا ہے۔ ان کے خیال میں تصوف نہ صفت سے مشتق ہے اور نہ ہی یونانی فلسفہ سے ماخوذ ہے، بلکہ یہ شریعت کا جوہر اور دین کا لب لباب ہے۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں شیخ نے حضرت ولی اللہ محدث دہلوی کی رائے کو نقل کیا ہے۔ شیخ نے بہت سے عربی اور ہندوستانی محدثین اور علماء قدر کی آرا کو نقل کر کے اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ تصوّف دین کا جوہر ہے اور باطن کی تعمیر کا صحیح راستہ ہے۔ ایک جگہ تصوّف کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"غرض ہم جس تصوّف کے اثبات کے قائل ہیں وہ وہی ہے جس کو اصطلاح شرع میں احسان کہتے ہیں، یا جس کو علم الاخلاق کہا جاتا ہے یا تعمیر الظاہر و باطن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور یہ بات بالنظم و با اصول چیز ہے، اس میں مریدین کے لیے بھی شرائط ہیں اور شیخ کے لیے بھی اصول و آداب ہیں جس کی رعایت کرنے کے بعد اس کو شریعت کا مغز اور دین کا لب لباب کہنا بجا ہے۔"[۶۸]

۶۷ؐ آپ بیتی نمبر ۶، صفحہ ۵۲ تا ۵۴

۶۸ؐ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب، صفحہ ۲۶۴

Marfat.com

تصوف کے جن عناصر کا ذکر شیخ الحدیث نے مختصر اور جامع انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس کی تشریح اور وضاحت ڈاکٹر عنوان چشتی نے ان الفاظ میں کی ہے:

"اسلام کی وہ تعبیر جس میں اعمال ظاہری پر حکم لگایا جاتا ہے لیکن اعمال باطنی کی نفی نہیں کی جاتی فقہ کہلاتا ہے اور اسلام کی وہ تعبیر جس میں اعمال باطنی پر زور دیا جاتا ہے لیکن اعمال ظاہری سے صرف نظر نہیں کیا جاتا تصوف کہلاتا ہے مولانا اشرف علی تھانوی نے لکھا ہے کہ ابتداً شریعت اعمال ظاہری اور باطنی دونوں پر محیط تھی لیکن آگے چل کر شریعت کے جز متعلق بہ اعمال ظاہری کا نام فقہ اور جزو متعلق بہ اعمال باطنی کا نام تصوف ہوگیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ اور تصوف میں تضاد نہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں انھوں نے تصوف کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اعمال باطنی کے طریقوں کو طریقت کہتے ہیں۔ پھر اعمال باطنی کی درستی سے قلب میں جو صفا اور جلا پیدا ہوتا ہے اور اس سے انسان حقائق الٰہی اور حقائق کونیہ سے آگاہ ہوتا ہے نیز اس پر عبد و معبود کے رشتہ کے اسرار کھلتے ہیں۔ ان مکشوفات کو حقیقت اور انکشاف کو معرفت کہتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ تصوف اسلام کے دائرے میں ہے اور شریعت کا ایک مخصوص پہلو ہے، جو تزکیہ باطن اور تہذیب نفس پر زور دیتا ہے اور بصارت پر بصیرت نیز معلومات پر معرفت کی فوقیت پر اصرار کرتا ہے۔ حضرت شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا ہے کہ تصوف کا اول علم اوسط عمل اور آخر عطا من اللہ تعالیٰ ہے۔ جس کو دوسرے الفاظ میں بالترتیب تصوف کے علمی، عملی اور کشفی پہلو کہا جا سکتا ہے۔" ۶۹ھ

ڈاکٹر عنوان چشتی نے بڑی صراحت کے ساتھ تصوف کے ان عناصر کی تشریح کی ہے جو فقہ اور شرح پر محیط ہیں۔ شیخ بھی تصوف کو انھیں اوصاف کا مجموعہ تصور کرتے تھے۔ انھوں

۶۹ھ ماہنامہ برہان، دہلی، جلد نمبر ۸۷، شمارہ نمبر ۳، ستمبر ۱۹۸۱ء، ص ۴۸ - ۴۷

Marfat.com

نے عربی و عجمی تصنیف کی اصطلاحات کو کوئی وقعت نہیں دی۔ البتہ وہ ان بدعات کے مخالف نظر آتے ہیں جو بعض گمراہ لوگوں نے تصوف کے نام پر رائج کر رکھی ہیں۔ اس بات پر خاص زور دیا ہے کہ اپنے پیر کی ذات سے عشق کرنا ہی اصل سلوک ہے اور اس کی توجیہہ یہ کی ہے نفع بطریق جذب ہوتا ہے۔ طریقت کے اذکار و اشغال کے سلسلہ میں چند اہم نکتے بیان کئے ہیں۔ ان سب کا لب لباب یہ ہے کہ صوفیار نے اذکار و اشغال اور مراقبات کی تعلیم دی ہے، ان کا مقصد اللہ تعالیٰ کی حضوری ہے۔ انھوں نے چلّہ وغیرہ کا جواز تحریر فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے سالک کی توجہ ایک جگہ مرتکز ہو جاتی ہے اور ما سوا کا خیال دل سے نکل جاتا ہے۔ شیخ نے پیر اور مرید کے باہمی رشتہ پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ پیر کی معمولی ناراضی اتنی مضر نہیں جتنی مرید کی طرف سے عقیدت میں کوتاہی مضر ہے۔ خلاصہ کے طور پر لکھا ہے کہ طریق باطن میں یا تو کامل اتباع اختیار کرے ورنہ علیحدگی اختیار کرے۔ اس طرز فکر و عمل سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ اس دور کے زبردست عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ باطن صوفی بھی تھے۔

شیخ نے نسبت کی اہمیت پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک اس کا منتہا تو دریائے عشق میں ڈوب جانا ہے لیکن شیخ نے ان اقسام کو قاری تک پہنچانے کے لئے حضرت عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی تفسیر کا سہارا لیا ہے اور اس طرح حضرت محدث دہلوی کے الفاظ میں نسبت کی چار اقسام گنوائی ہیں:

(۱) انعکاسی (۲) نسبت القائیہ

(۳) نسبت اصلاحی (۴) نسبت اتحادی

نسبت اصلاحی کے باب میں حضرت ابوسعید گنگوہیؒ اور حضرت نظام الدین بلخی کا قصہ نقل کیا ہے کہ کس طرح حضرت بلخی نے حضرت ابوسعیدؒ سے مشقتیں اٹھوائیں اور پھر روحانی نعمت عطا کی۔ نسبتِ اتحادی کو واضح کرتے ہوئے حضرت باقی اللہ اور طباق کا مشہور واقعہ بیان کیا ہے اور حضرت شاہ غلام بھیکؒ اور ابوالمعالیؒ کے واقعات نقل کئے ہیں کہ شیخ نے خوش ہو کر دوسرے شیخ کو سینہ سے لگا لیا اور دل کو نور معرفت سے بھر دیا۔ ان واقعات کو نقل کرنے کے بعد شیخ حضور نبی کریمؐ اور حضرت جبرئیل کا واقعہ تحریر کرتے ہیں کہ حضرت جبرئیلؑ نے

Marfat.com

تین بار حضور اکرمؐ کے جسم اطہر کو مس کیا تھا۔ اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد شیخ نے بڑے عالمانہ انداز میں جبریلؑ کے تین بار مس کرنے کی تشریح کی ہے اور لکھا ہے کہ جبریلؑ نے بحکم ربی اول بار نسبت القائیہ اور دوسری بار نسبتِ اصلاحی اور تیسری بار نسبت اتحادی کے لیے حضور اکرمؐ کے جسم اطہر کو مس کیا تھا۔ اس مجتہدانہ تشریح کے بعد حضور کے مدارج مراتب بیان کرنے میں اپنے عجز کا اعتراف کیا ہے اور یہ سلسلہ اس شعر پر ختم کیا ہے ؎

بیانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست [ؔ]

اہل اللہ کے نزدیک خودستائی اور دوسروں کی تحقیر سخت گناہ ہے۔ شیخ نے اس بات کو مزید واضح کرنے کے لیے حضرت ابوعبداللہؒ اندلسی کا مشہور واقعہ نقل کیا ہے کہ کس طرح شیخ کا گزر عیسائیوں کی بستی میں ہوا اور ان کو شرک و ضلالت میں دیکھ کر ابوعبداللہ کے دل میں خیال آیا کہ یہ کتنے گمراہ ہیں۔ ہم راہِ حق پر ہیں۔ بس یہ خیال آنا تھا کہ آواز غیبی آئی کہ یہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے اگر تم غرور کرتے ہو تو ابھی تمہیں سبق سکھا دیں۔ یہ وسوسہ گزرنا تھا کہ ایمان کی دولت سلب ہوگئی اور وہ ایک لڑکی پر عاشق ہو کر سور چرانے لگے۔ وہ حضرت شبلیؒ اور دیگر مریدوں کے اصرار پر واپس نہ ہوئے۔ اس کے بعد جب خدا نے ان کی تقصیر معاف کی تو پھر ایمان کی دولت ہاتھ آئی۔ یہ قصہ نقل کرنے کے بعد شیخ متنبہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :

"آخرت کا معاملہ بڑا سخت ہے اور عجب پندار اور دوسروں کی تحقیر و تنقیص یہ نہایت خطرناک امور ہیں جیسا کہ اوپر کے سور کے قصہ سے معلوم ہوگا۔ اللہ ہی محفوظ رکھے۔ ان سے بہت زیادہ بچنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور میرے دوستوں کو اس سے محفوظ رکھے۔" [اؔ]

تصوف کے ان بیانات اور شیخ کی تشریحات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شیخ کی شخصیت شریعت اور طریقت کا دلنواز پیکر تھی۔ وہ صاحبِ حال و قال بزرگ تھے جہاں

ؔ آپ بیتی نمبر ۵، ص ۱۲۹ اؔ آپ بیتی نمبر ۵، ص ۱۲۹

Marfat.com

اختلافی مسائل کا تعلق ہے، ان کی آپ بیتی میں ایسی باتوں کا فقدان ہے۔ البتہ ایک جگہ یہ ضرور لکھا ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں علم غیب کے قائل نہیں ہیں۔ اور اہل بدعت سے گریز کا مشورہ دیا ہے لیکن اہل بدعت کی تشریح نہیں کی۔ دنیا جانتی ہے کہ حضرت شیخ بزرگان دین کے مزاروں پر گھنٹوں مراقبے کی حالت میں رہتے تھے اور فیوض و برکات حاصل کرتے تھے۔

اسلام زندگی کے ہر دائرے پر محیط ہے۔ اس سے سیاست بھی علیحدہ نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے عالم دین اور تارک الدنیا ہونے کے باوجود حالات زمانہ کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ان کے یہاں جو سیاسی حالات ملتے ہیں وہ مذہبی مقصد کے تابع ہیں۔ ان کی آپ بیتی میں ۱۹۴۷ء کے خونریز تصادم کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس وقت کی دلّی اور اہل دہلی خصوصاً مسلمانوں کی حالت کی تصویر نظر آتی ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے دو گروہ تھے ایک کانگریسی اور دوسرا لیگی۔ حضرت حسین احمد مدنی کانگریسی تھے اور حضرت اشرف علی تھانوی لیگی نظریات کے حامی تھے۔ اس کیفیت کو شیخ نے یوں تحریر کیا ہے:

> "تقسیم ہند کا زور شور تو کئی سال سے روز افزوں تھا۔ دن رات جلسے ونعرے اور شور و شغب ہر وقت رہتا تھا۔ کانگریس کا پلہ اس نواح میں زیادہ غالب تھا اور لیگ کا مغلوب تھا۔ جو شخص لیگ سے ذرا بھی تعلق رکھتا یا کانگریس کے ساتھ خصوصی تعلق کا اظہار نہ کرتا وہ لوڈی انگریزوں کا نمک خوار اور ان کا پٹھو، غلام کے نعروں سے علی الاعلان مطعون کیا جاتا اور کانگریس والے لیگ کی نگاہوں میں انگریز کے غلام اور زرخرید وغیرہ وغیرہ الفاظ سے یاد کیے جاتے تھے۔ ایک دوسرے کی تفسیق و تذلیل ایسی برملا ہو رہی تھی جس کی انتہا نہ تھی۔" ؎۵۲

اقتباس بالا اس بات کا ثبوت ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے ملک کے دوسرے حصوں کی طرح سہارن پور اور مظفر نگر وغیرہ کے اطراف میں مسلمانوں کے دو سیاسی گروہ تھے۔ اور ان

---

۵۲ آپ بیتی نمبر ۵، ص ۳

Marfat.com

میں باہمی چوٹیں ہوا کرتی تھیں ۔علماء دو گروہوں میں بٹ گئے تھے ۔طرفین ایک دوسرے کے خلاف فتوے صادر کرتے تھے ۔شیخ نے لکھا ہے کہ ان کا رویہ اعتدال کا تھا اور انھوں نے مسلمانوں کی انتہا پسندی دیکھ کر ایک کتابچہ "الاعتدال" تحریر کیا جو دونوں طبقوں میں مقبول ہوا ۔اگرچہ اس میں شیخ نے کھل کر کچھ تحریر نہیں کیا ہے لیکن بین السطور میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ ان کا رجحان کانگریس کی طرف تھا ۔وہ انتہائی عقیدت کے باوجود مولانا اشرف علی تھانوی سے سیاسی ہم آہنگی نہیں رکھتے تھے ۔وہ آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات کے وقت دہلی کی بنگلہ والی مسجد میں مقیم تھے ۔انھوں نے انسانوں کی خونریزی کا منظر اور مہاجرین کی ہجرت کا عالم اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔شیخ نے ان واقعات کی پوری تفصیل تو نہیں دی صرف اتنا تحریر کیا ہے کہ آنکھوں کے سامنے قیامت کا منظر تھا ۔والدین اپنے شیر خوار بچوں کو اسٹیشن پر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے ۔ان کا جواب تھا کہ اگر زندہ پاکستان پہنچے تو بچے اور ہو جائیں گے لوگ اپنے گھروں اور جانوروں کو فسادیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر بھاگے تھے ۔شیخ نے ۲۲ ستمبر کو جانے والی اسپیشل ٹرین کی قتل و غارت گری کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے کہ جو پولس والے ٹرین کے ساتھ تھے وہ ارتکاب جرم میں پیش قدمی نہ سہی تو چشم پوشی ضرور کرتے تھے ۔اس وقت جماعت کے مرکز میں لگ بھگ ۵۰۰ افراد تھے ۔جنھیں پندرہ آدمیوں کا راشن ملتا تھا ۔ایسی صورت میں وہ جانور جو لوگ چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، یا ہدیہ کر گئے تھے، غذا کے لیے استعمال ہوتے تھے ۔اس دوران دو بار مسجد کی تلاشی ہوئی اور کئی بار مسجد پر حملہ کی خبر ملی لیکن ہر بار بفضلِ خداوندی شر کرنے والے بھاگ کھڑے ہوتے ۔شیخ کی اس تحریر سے ۱۹۴۷ء کے فسادات کی شرم ناک داستان معلوم ہوتی ہے ۔ان حالات کے علاوہ شیخ نے نہ کوئی سیاسی تبصرہ کیا ہے اور نہ حالات پر اپنی رائے دی ہے ۔اس انداز سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ نے یہ حالات محض حقیقتِ حال کے اظہار کے طور پر تحریر کیے ہیں ۔انھوں نے سیاست کا یا زمانہ کا شکوہ نہیں کیا ۔گویا یہ بھی رضائے الٰہی کا معاملہ تھا ۔

مذہبی خود نوشت خواہ اس کا مصنف عالم ہو یا صوفی ایک نوع کی مقصدیت کی حامل ہوتی ہے ۔جب ادب میں مقصدیت در آتی ہے تو مصنف موضوع، مواد اور اسلوب کی ہر

Marfat.com

سطح پر اس کا پابند ہو جاتا ہے ۔ چنانچہ مذہبی خودنوشت سوانح نگاری کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے اور اس کا ایک جداگانہ اسلوب ہوتا ہے جس کا تعین مقصد کرتا ہے شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ کی خودنوشت مذہبی آپ بیتی کی سنجیدگی اور اسلوب کی پختگی کی آئینہ دار ہے ۔ ایسی دوسری خودنوشتوں کی طرح یہ خودنوشت بھی بیانیہ انداز کی حامل ہے اور بیانیہ اسلوب کی خصوصیات کی حامل ہے ۔ اس میں سادگی، صفائی، سریع الفہمی کی خصوصیات ملتی ہیں شیخ بذات خود سادگی پسند انسان تھے، وہی سادگی ان کی آپ بیتی میں ہے ۔ اس کے علاوہ شیخ پابند شرع تھے اور سچائی اور حق گوئی میں اپنی مثال آپ تھے ۔ اس لیے انھوں نے واقعات کو تحریر کرنے میں سچائی کا دامن نہیں چھوڑا ۔ واقعات کو بے کم و کاست بیان کیا ہے ۔ بول چال کی زبان کا سہارا لیا ہے اور جو واقعہ جیسے گزرا اسے ویسے ہی تحریر کر دیا ہے جب کہ دوسری خودنوشتوں میں مصنف کا جذباتی ردعمل بھی سامنے آیا ہے ۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ شیخ نے اس سے بھی اجتناب کیا ہے ۔ ان کے الفاظ خیال کی ترسیل تو کرتے ہیں لیکن جذبات کی ترسیل نہیں کرتے ۔ انھوں نے اپنی والدہ کے انتقال کا حال بھی غیر جذباتی انداز میں تحریر کیا ہے ۔ لکھتے ہیں :

> "میرے والد صاحب کے انتقال کے دن ہی سے میری والدہ مرحومہ نوراللہ مرقدہا اعلی اللہ مراتبہا کو بخار شروع ہوا ۔ تھوڑے ہی دنوں میں تپ دق کی طرف منتقل ہو گیا اور دس ماہ چند ایام بعد ۲۵ رمضان المبارک شب قدر میں عین تراویح کے وقت ان کا وصال ہو گیا ....
>
> . . . .
>
> میں جب گھر پہنچا تو میری والدہ کو نزع شروع ہو چکا تھا ۔ تھوڑی دیر بعد وہ تو اللہ کے یہاں پہنچ گئیں اور میں دارالطلبہ حاضر ہوا ۔ حضرت قدس سرہٗ سے عرض کیا کہ والدہ کا انتقال ہو گیا ۔" [۵]

مندرجہ بالا اقتباس سے قاری کو صرف حادثۂ انتقال کی اطلاع پہونچ جاتی ہے لیکن مصنف کا جذباتی ردعمل معلوم نہیں ہوتا ۔ اگر کوئی غیر شخص اس واقعہ کو تحریر کرتا تو اس کا انداز بھی

---

[۵] آپ بیتی نمبر ۳، ص ۸۱-۸۲

Marfat.com

یہی ہوتا جو شیخ نے اپنایا ہے۔ انسانی فطرت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ ماں جیسی شفیق ہستی کے انتقال پر شیخ کو صدمہ نہ ہوا ہو۔ لیکن انھوں نے اس صدمہ کو جس معروضی انداز سے بیان کیا وہ ان کی روحانی بصیرت اور تعلق باللہ پر دلالت کرتا ہے۔ ان کی آپ بیتی کی زبان عربی آمیز ہے۔ اس میں بعض ایسے نامانوس الفاظ کی آمیزش ہے کہ قاری کو لغت کا رہین منت ہونا ہی پڑتا ہے۔ اصطلاحات علماء اور صوفیاء کی اتنی فراوانی ہے کہ ادب کا عام قاری مفاہیم کی تہہ تک آسانی سے نہیں پہنچ سکتا۔ اس پر طرہ یہ کہ عربی کی آیات اور جملے کے جملے نقل کئے گئے ہیں اور ان کا ترجمہ نہیں دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایسے چند جملے اور الفاظ دیے جاتے ہیں ـــــ ہٰذا انما یعلم ولا یفتی یا یہ حدیث والقرآن یکون کفرا ـــــ الفاظ میں لاعلی التعین، انصبات اوقات، مکبر الصوت ان تعبداللہ کانک تراہ، اختفال، منتہا، مناظرہ کرنا (بحث کی جگہ پر) اسی کے ساتھ شیخ کے اسلوب اور زبان پر مقامی رنگ کا اثر بھی تھا۔ ایک بارات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

> "شادی میں کنور عنایت علی خان مع اپنے لنگاڑوں کے شریک تھے اور بار بار کہہ رہے تھے کہ کیا مولویوں کی بے مزہ شادی ہے۔ سارے مردے آکر جمع ہو گئے ہیں رات کو عشاء کے بعد سے زور دار طوفانی بارش شروع ہوئی کہ سیکڑوں آدمی شامیانے کے نیچے سو رہے تھے کہ ایک دم قیامت کا شور اٹھا جبر جنگم شامیانہ ٹوٹ کر اسی طرف جھک گیا جدھر سب سے الگ خالو عثمان صاحب کا پلنگ تھا۔"[۴۷]

مندرجہ بالا جلی الفاظ کے علاوہ کہیں غصیارے، لونڈے اور اسی قسم کے سیکڑوں الفاظ ایسے ہیں جو شیخ نے استعمال کیے ہیں۔ ویسے شیخ نے چاشنی دار زبان نہ سہی، روزمرہ ضرور لکھی ہے۔ انھوں نے بعض محاوروں کا استعمال بھی کیا ہے۔ مثلاً ریل پیل ہونا، منگولی گئیں، چھا جوں پانی برسا۔ ان ساری باتوں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یا تو شیخ نے اپنی آپ بیتی صرف عربی مدرسوں کے طلبا اور عربی داں حضرات کے لیے قلم بند کی ہے یا ان کے مخاطب عربی داں علماء ہیں۔ اس کے باوجود

۴۷؎ آپ بیتی نمبر ۵، ص ۱۰

Marfat.com

شیخ کی پوری خودنوشت پڑھنے کے بعد یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم اتنے بڑے محدث اور عالم دین کی آپ بیتی پڑھ رہے ہیں۔ انھوں نے ہر جگہ عالمانہ انکسار سے کام لیا ہے اور خود کو ہمیشہ ناکارہ، سیاہ کار، ناواقف وغیرہ الفاظ سے یاد کیا ہے۔ شیخ نے اپنی پوری خودنوشت میں ایک رہبر کا کردار ادا کیا ہے۔ لیکن کمال خاکساری یہ ہے کہ خود کو ہمیشہ پردے کے پیچھے رکھا خودنوشت کی چاروں جلدوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شیخ کے پیش نظر خودنوشت کا مقصد تبلیغ دین اور تربیت طلبائے حق ہے۔ اس مقصد کو لے کر شیخ نے اپنے ذاتی تجربوں کے پردے میں علم وحکمت کے بے بہا خزانے لٹا دئے ہیں۔ فنی لحاظ سے اس میں کچھ کمیاں بھی ہیں جن کا تذکرہ اپنے مقام پر کیا جا چکا ہے۔ زبان و بیان کی نہج پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شیخ نے جگہ جگہ عربی آمیز ادق زبان اور محاورات کا استعمال کیا ہے۔ یہ شیخ کی عادت تحریر بھی ہو سکتی ہے اور موضوع کی مجبوری مختصراً یہ کہ باوجود فنی کمیوں اور زبان کی ثقالت کے یہ خودنوشت سچائی، معنویت اور اعلیٰ مقاصد کی حامل ہے۔ غالباً اردو میں مذہبی خودنوشتوں میں یہ واحد خودنوشت ہے، جو مذہب، روحانیت، تصوف، اسلامی تاریخ اور تہذیب کا عظیم ترین سرچشمہ ہے۔

Marfat.com

خود آگہی

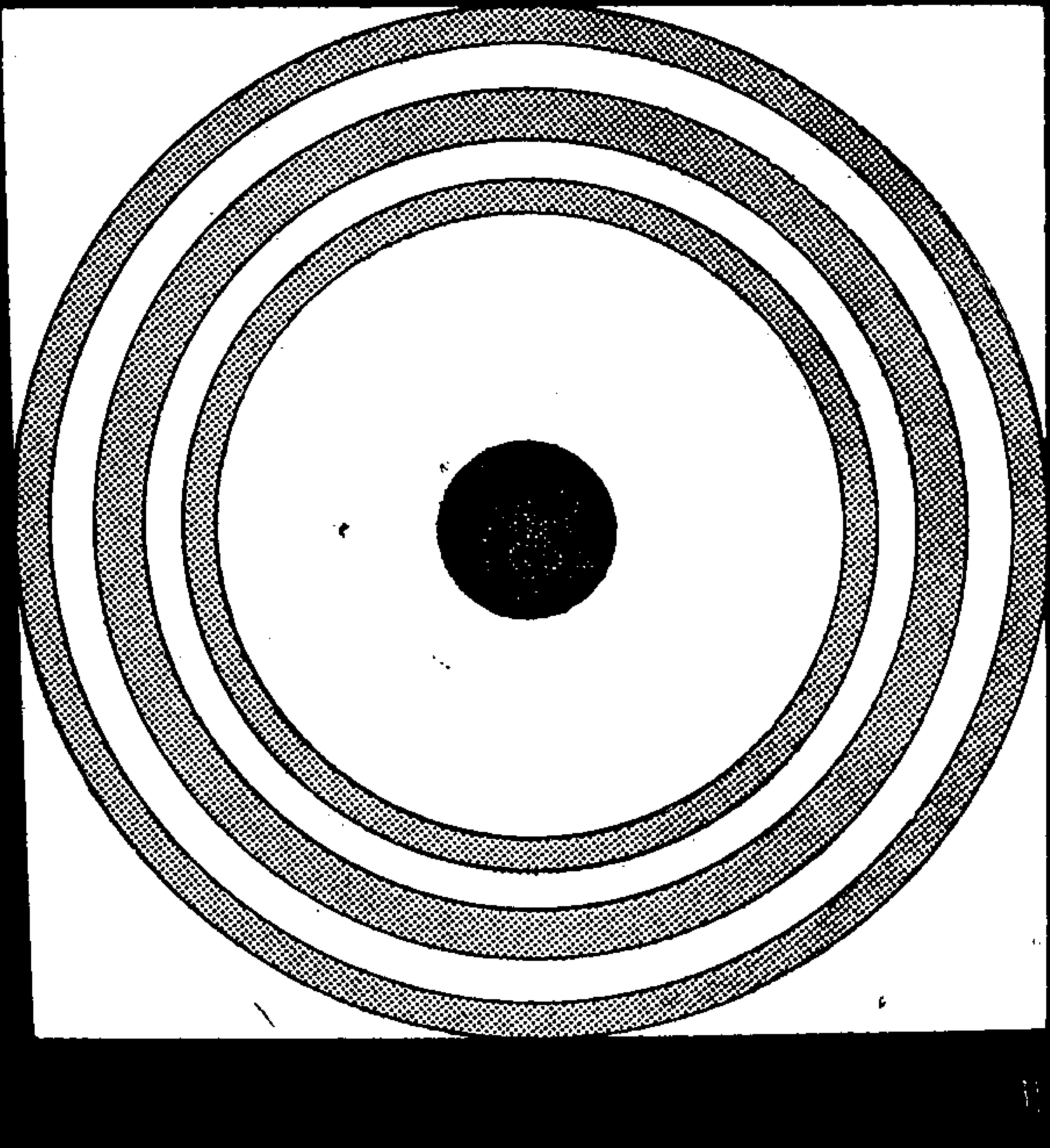

297.
خ 3
770

وہاج الدین علوی

Marfat.com